کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۹۹، قیمت ۱۲/ پتہ :- مدرسۂ ملت، مالیگاؤں، ضلع ناسک،

مبتدیوں کے لئے عربی کی بہت سی ریڈریں لکھی جاچکی ہیں، یہ نئی ریڈر مولانا عبدالحمید نعمانی کی تالیف ہے، وہ جید عالم ہیں، اور اُن کو درس وتدریس کا بھی پورا تجربہ ہے، اور عربی زبان وادب میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل ہے، اس لئے انھوں نے اس میں صرف ونحو کے مبادیات اور عربی کے ضروری قواعد نہایت دلنشیں اور سلیس وسادہ انداز میں مشقی سوالات اور تمرینوں کے ساتھ تحریر کئے ہیں، امید ہے مدارس کے علاوہ عام عربی سیکھنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے،

**انتخاب رُباعیات مولانا روم** — مُرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی تقطیع خورد، خوبصورت ٹائپ صفحات: ۷۶، پتہ : مولانا نجم الدین اصلاحی، سدھاری - اعظم گڈھ،

مولانا جلال الدین رومی کی سب سے مشہور ومقبول تصنیف مثنوی ہے، مثنوی کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی اُن کی یادگاریں ہیں انہیں انکی رُباعیات بھی ہیں جس سے کم لوگ واقف ہیں، ۱۳۱۲ھ میں مولانا کی رُباعیات کا ایک مجموعہ استنبول سے شائع ہوا تھا، جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پاس تھا، انہی کے ایما سے مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے اس کا انتخاب مرتب کیا تھا جس کو انھوں نے نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا اور اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی کے نام معنون کیا ہے، شروع میں مولانا روم کے مختصر حالات بھی درج ہیں، انتخاب خوش مذاقی سے کیا گیا ہے اور ڈیڑھ سو رُباعیات پر مشتمل ہے، مولانا روم کی مثنوی کی طرح انکی رباعیات بھی اسرار وحکم اور عشق ومعرفت کا خزینہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں،

"ض"

---

جلد ۱۰۰ - ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۷ء - عدد ۶

مضامین



مقالات



ادبیات

# شذرات

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ کی وفات سے رشد و ہدایت کا ایک روشن چراغ گل ہوگیا، وہ اس دور کے بڑے شیخ طریقت اور سالکین کی اصلاح و تربیت میں اپنے مرشد حضرت مولانا تھانوی کا نائب تھے، اُن کی وفات کے بعد اُن کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی تھی، اُن سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی انکی اصلاح و تربیت سے ہزاروں بگڑی ہوئی زندگیاں سنور گئیں، گم کردہ راہوں کو راہ راست اور تاریک دل کو ایمان کی روشنی ملی، ادھر چند برسوں سے جب مولانا نے اپنے وطن فتح پور تال نرجا کا گوشۂ عافیت چھوڑ کر الہ آباد کا قیام اختیار فرمایا آپ کا فیض پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا رجوع خاص طور سے بہت بڑھ گیا تھا، اور اس کو خصوصیت سے زیادہ فائدہ پہنچا،

حضرت مولانا خلقۃً نحیف و ناتواں تھے، عمر کے تقاضے اور فالج کے اثر نے اور کمزور کر دیا تھا، اس کے باوجود آپ کے معمولات اور فیض رسانی میں فرق نہ آیا تھا، اسی حالت میں گذشتہ شعبان میں حج کا قصد فرمایا، مگر وقت موعود آچکا تھا، جہاز کی روانگی کے کل دو دن بعد ۲۵ نومبر کی شب کو تہجد کی نماز سے فراغت کے بعد اور فجر کی نماز سے پہلے روحِ مبارک عالم قدس میں پہونچ گئی، جہاز کے قاعدہ کے مطابق ہر متوفی کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد سمندر کی موجوں کے حوالے کر دی جاتی ہے، مگر جس دربار سے طلبی ہوئی تھی، اُسی نے اس کا انتظام بھی کر دیا کہ لاش کو جدہ لے جانے کی اجازت مل گئی، اور یقین ہے کہ اس وقت تک جسدِ خاکی کو جنۃ البقیع کی مقدس سرزمین میں سپرد خاک



کر دیا گیا ہوگا،

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا،

حضرت مولانا کی وفات سے رشد و ہدایت کی ایک بڑی مسند خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ اُن کے مدارج بلند فرمائے، آپ کے متوسلین "معرفت حق" کے نام سے ایک پرچہ نکالتے ہیں، حضرت مولانا کی اصلاحی تقریریں، ملفوظات اور اصلاح و تربیت کے متعلق سوالات و جوابات شائع ہوتے ہیں، یہ ملفوظات اصلاح و تربیت کے نصاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ حضرت مولانا تھانوی کے مواعظ و ملفوظات کی طرح اُن کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ ان کا افادہ مستقل قائم رہے،

اس وقت دار المصنفین دوہری مشکلات میں مبتلا ہے، اُس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اسکی تجارت ہے، ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے زمانہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بالکل بند ہے جن سے دار المصنفین کی آمدنی نصف کے قریب گھٹ گئی ہے اور تنہا ہندوستان کی تجارت پر اُس کا مدار رہ گیا ہے، جو اُس کے مصارف کے لئے ناکافی ہے، اور موجودہ ہوشربا گرانی کی وجہ سے اُس کے مصارف پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئے ہیں، اسلئے وہ کئی سال سے مالی مشکلات میں مبتلا ہے، جوبلی کے موقع پر جو رقم ملی تھی، اس کو ملا کر کام چلتا رہا، مگر اب وہ بھی ختم کے قریب ہے، دار المصنفین نے کبھی چندہ کے لئے دست سوال دراز نہیں کیا، اور اب بھی وہ اس وضعداری پر قائم ہے، اس کی سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ اُس کے قدردان اُس کی کتابوں کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں، اصحاب استطاعت اُس کے لائف ممبر بنیں، جس کی فیس یکہزار

اور پانسو اک مُشت ہے، ایک ہزار کے ممبروں کو اُس کی تمام گذشتہ اور آیندہ مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، جن کی قیمت ایکہزار کے قریب ہو جاتی ہے، اور انکو اپنی امداد کا معاوضہ کتابی شکل میں مل جاتا ہے، پانسو کے ممبروں کو ممبری کے وقت سے نئی مطبوعات پیش کی جاتی ہیں جس میں معارف بھی شامل ہے،

---

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے دورِ نظامت میں دار العلوم ندوۃ العلماء نے ہر پہلو سے بڑی ترقی کی ہے، اسکی شہرت اسلامی ملکوں تک پھیل گئی ہے، چنانچہ اس وقت عرب اور افریقہ تک کے طلبہ ندوہ میں زیر تعلیم ہیں، طلبہ کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، جس سے مصارف میں قدرۃً اضافہ ہو گیا ہے، پچھتر ہزار سالانہ صرف طلبہ کے وظائف پر صرف ہو رہا ہے، اور سالانہ بجٹ ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ گیا ہے، طلبہ کی کثرت کی وجہ سے عمارتوں میں بھی اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، ندوہ کی مسجد تک نمازیوں کے لئے ناکافی ہو گئی ہے، اس لئے تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے، ان مصارف کے مقابلہ میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں ہے، اور نہ اُس میں کوئی خاص اضافہ ہوا ہے، اسلئے دار العلوم ندوۃ العلماء بھی مالی مشکلات میں مبتلا ہے،

---

اس زمانہ میں جبکہ مختلف سمتوں سے مسلمانوں کے مذہب اور انکی تہذیب کو مٹانے کی کوشش جاری ہے، خود مسلمانوں کا ایک دانشور طبقہ ذہنی ارتداد کا شکار ہو چکا ہے، اس کو حکومت اور اکثریت کی خوشنودی کیلئے اپنے دین و ملت کو بھی قربان کرنے میں تامل نہیں ہے، اور اسکے اثرات مسلمانوں کی تعلیم جدید کے بعض مرکزی اداروں تک پہنچ گئے ہیں، صرف عربی مدارس ہی وہ قلعے باقی رہ گئے ہیں جنکے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب و تہذیب و روایات کی حفاظت ہو سکتی ہے، اور ہندوستان میں آیندہ اسلام و ملت اسلامیہ کی بقا انہی پر موقوف ہے، اسلئے اُن کو باقی رکھنا مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی و ملی فریضہ ہے، ہم کو امید ہے کہ اصحاب خیر دار العلوم ندوۃ العلماء کی پوری امداد کریں گے،



# مقالات

## حارث بن اسد محاسبی

از مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری دار العلوم اشرفیہ راندیر

**نام و نسب** ابو عبد اللہ کنیت، حارث بن اسد نام، بصرہ جائے ولادت، بغداد مسکن و جائے وفات نفس کا بکثرت محاسبہ فرماتے تھے، اس لئے المحاسبی کے لقب سے مشہور ہوئے[1]، تاریخ ولادت معلوم نہیں، وفات بغداد میں ۲۴۳ھ میں ہوئی،

**اساتذہ و تلامذہ** یزید بن ہارون اور اس طبقے کے محدثین سے حدیث روایت کرتے تھے، تلامذہ میں ابو العباس بن مسروق، احمد بن حسن بن عبد الجبار، جنید بغدادی، اسمٰعیل بن اسحٰق سراج، ابو علی حسین بن خیران، احمد بن قاسم بن نصر، احمد بن عبد اللہ میمون وغیرہ ہیں،

**فضائل** علامہ مناوی "کواکب دریہ" میں محاسبی کے متعلق رقمطراز ہیں:-

| | |
|---|---|
| قال التیمی ھو امام المسلمین | تیمی کہتے ہیں فقہ و حدیث اور کلام |
| فی الفقہ و التصوف والحدیث | و تصوف میں وہ مسلمانوں کے |
| والکلام[2] | امام ہیں، |

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۳۴۹ مطبوعہ مصر ۱۹۴۸ء بتحقیق محمد محی الدین عبد الحمید [2] الکواکب الدریہ فی تذکرۃ الصوفیہ جلد ا ص ۲۱۶

ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

احد رجال الحقیقة وھو ممن جمع له علم الظاھر والباطن[1]

حقیقت و معرفت کے واقفکار، علم ظاہر و باطن کے جامع ہیں،

حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں تحریر فرماتے ہیں:۔

والمحاسبی العارف صاحب التوالیف صدوق فی نفسه وقد نقموا علیه بعض تصوفه وتصانیفه[2]

عارف محاسبی صاحب تصنیفات بذاتہ صدوق ہیں البتہ انکے تصوف و تصانیف پر نکتہ چینی کی گئی ہے،

ابو القاسم قشیری نقل فرماتے ہیں:۔

"عبد اللہ بن حنیف فرماتے تھے کہ ہمارے شیوخ میں پانچ کی اقتدا کرو، اور باقیوں کے احوال خود ان کے حوالہ کرو، (۱) حارث بن اسد محاسبی (۲) جنید بن محمد بغدادی، (۳) ابو محمد رویم (۴) ابو العباس بن عطا، (۵) عمرو بن عثمان، کیونکہ یہ مذکور حضرات علم و حقائق کے جامع ہیں"[3]

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ (مقیم حلب) ان کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"امام عارف، علوم حکمت و معرفت میں رطب اللسان، تقوی و تقدس، علم و عمل، معاملات و حالات میں عدیم النظیر، زہد و عبادت، پند و مواعظ میں بے مثال فقیہ و متکلم اور خطابت میں فرد تھے"[4]

**مشاغل** محاسبی اپنے تمام اوقات پند و موعظت، ریاضت و عبادت اور تالیف کتب میں صرف

[1] وفیات حوالہ سابق [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۹۹، ۲۰۰ [3] رسالہ قشیریہ ص ۱۵

[4] مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۱



فرماتے تھے، زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے تھے، کوئی گھڑی ایسی نہیں گذرتی تھی کہ کوئی نیک کام نہ کرتے ہوں، اسی لئے کثیر التصانیف بھی تھے، تاج الدین ابن السبکی نے ان کی تصنیفات دو سو تک لکھی ہے[1]

**موضوع تصانیف** دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں روایت حدیث، تفسیر، مغازی اور سیرت کا عام مذاق تھا، جو تصنیف بھی عالم وجود میں آتی تھی وہ انہی میں سے کسی ایک موضوع پر ہوتی تھی، ایسے وقت میں محاسبی کا موضوع تصنیف اخلاقیات، زہد و تصوف، رد بدعات و عقائد باطلہ تھا، وہ انسانی عیوب کا پتہ لگاتے اور ان کی اصلاح کا طریقہ بتاتے، ان کی تصنیفات کا بڑا حصہ اسی موضوع پر ہے، کتاب الرعایہ، کتاب التوہم، رسالۃ المسترشدین اس فن کے انمول جواہر ہیں، ان کے علاوہ خوارج، معتزلہ، روافض و قدریہ کے عقائد کے رد، اصول دین اور فقہ و احکام میں بھی ان کی تصانیف ہیں،

کثیر التصانیف مصنفین عموماً رطب و یابس میں امتیاز نہیں کرتے، لیکن محاسبی کی تمام تصانیف معیاری ہیں، خصوصاً زہد و تصوف، تزکیہ و احسان، اور روح و نفس کے مباحث پر ان کی تصانیف بعد میں آنے والے مصنفین کے لئے سنگ بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہیں،

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:۔

المحاسبی خیر الامة فی علم المعاملة وله السبق علی جمیع الباحثین عن عیوب النفس وآفات الاعمال واغوار العبادات وکلامه

محاسبی علم المعاملہ میں خیر الامت ہیں نفسانی عیوب، نقائص اعمال اور انہماک فی العبادات کی خرابیوں پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان سب پر محاسبی سبقت لے گئے

[1] طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۲ ص ۳۷،

جد یوبان عملی علیٰ وجھہ[5] ہیں اور انکا کلام اس لائق ہو کہ اسکو بجنسہٖ نقل کیا جائے،

خود امام غزالیؒ ان سے بہت زیادہ متاثر اور ان کی تصنیفات کے خوشہ چین ہیں، علامہ زاہد الکوثری کی رائے ہے کہ:-

لقد کان اثر الامام المحاسبی علی الامام الغزالی کبیرا ولقد تبطن الغزالی کتاب الرعایۃ فی کتاب الاحیاء[2]

محاسبی کا امام غزالیؒ پر بڑا اثر پڑا ہے، انھوں نے محاسبی کی کتاب الرعایۃ کو اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں چھپا لیا ہے،

**طرز تصنیف** | محاسبی کا طرز تصنیف بھی عجیب تھا، حافظ ابو نعیم اصفہانی محاسبی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ حارث محاسبی میرے گھر آتے اور مجھ سے فرماتے آؤ ذرا تفریح کو چلیں، میں عرض کرتا وحدت و عزلت سے نکال کر، تنہائی کا امن و سکون ختم کرکے آپ مجھ کو آفات و بلیات میں پھنسانا، راستوں کی سیر و تفریح میں منہمک اور شہوات و خواہشات میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں، حضرت جنید فرماتے چلے چلو گھبراؤ نہیں، میں ان کو ساتھ لیکر روانہ ہو جاتا اور عجیب بات یہ دیکھتا کہ راستہ میں کوئی ناپسندیدہ چیز حائل ہی نہ ہوتی، جب ہم جنگل میں پہنچکر کسی مناسب جگہ بیٹھ جاتے تو فرماتے مجھ سے سوالات کرو، میں عرض کرتا میرے ذہن میں پوچھنے کے لئے کوئی سوال ہی نہیں ہے، فرماتے جو بھی دل میں آئے پوچھو، پھر خود سوالات کی بوچھار کر دیتے میں وہی سوالات ان سے پوچھتا، وہ ان کے برجستہ جوابات دیتے، اس کے بعد وہ گھر لوٹتے اور ان سے ایک کتاب تیار کر لیتے"[3]

اس طرز کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مصنف جب کسی مسئلہ کو سمجھا دیتا ہے تو اس کو یہ اندازہ ہو جاتا

---

[1] الکواکب الدریۃ ج ۱ ص ۲۱۸ [2] مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۲ [3] حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۷۴،



ہے کہ کون سی بات مخاطب جلد سمجھ جاتا ہے، اور کون سی بات تفصیل طلب ہوتی ہے، یا مخاطب کے لئے جلد اس کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے، اس کے بعد جب وہ اس مسئلہ پر قلم اٹھاتا ہے تو اسکی تصنیف بہت کامیاب ہوتی ہے،

**ادب و بیان** | عربی ادب و بیان کے اعتبار سے محاسبی کا شمار چوٹی کے لکھنے والوں میں ہے، ان کی تصانیف میں فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، ان کا قلم رواں، بیان موثر اور زبان شیریں ہوتی ہے، جن لوگوں نے کتاب الرعایۃ، کتاب التوہم اور رسالۃ المسترشدین کا مطالعہ کیا ہے، ان کو اس کا اندازہ ہوگا، ان میں اتنی دلکشی ہے کہ ان کے پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی،

**تصوف** | محاسبی کو زیادہ تر شہرت تصوف کی وجہ سے حاصل ہے، اس فن میں انکی تصانیف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن پاک، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ اور اعمال سلف سے استدلال کرتے ہیں، صوفیہ کی شطحیات اور فلسفیانہ بحثوں سے بالکل تعرض نہیں کرتے، انکے تصوف کا محور علم و عمل کی اصلاح، مراقبہ خداوندی، نفس کی رذائل و خبائث سے تطہیر، قرب الٰہی کے حصول کے طریقوں کی پیروی ہے، ان کی زندگی بڑی صاف ستھری تھی، اچھے مکان میں رہتے تھے، عمدہ لباس پہنتے تھے، ابو نصر سراج طوسی نے لکھا ہے،

کان للحارث دار حسنۃ و ثیاب نظاف[1]

حارث کا مکان عمدہ تھا اور کپڑے بھی عمدہ رکھتے تھے،

لیکن زہد کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت ایک درہم بھی پاس نہ تھا، ابن خلکان نے لکھا ہے،

مات وھو محتاج الی درھم[2]

وفات کے وقت پیسے پیسے کو محتاج تھے،

کتاب اللمع میں ایک اور واقعہ لکھا ہے، کہ ایک روز حارث محاسبی کے گھر ابو حمزہ صوفی آئے

---

[1] کتاب اللمع ص ۴۹۵ [2] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۵۰،

حارث کے مکان میں ایک بکری بندھی تھی اچانک وہ زور سے ممیائی تو اس پر ابو حمزہ صوفی کو وجد آ گیا انھوں نے کہا لبیک یا سیدی! کسی ابو حمزہ جیسے صوفی نے کہا ہے،

کسانیکہ یزداں پرستی کنند  بآواز دولاب مستی کنند

مگر حارث محاسبی سخت برہم ہوئے اور کہا کہ یہ حرکت نہایت نازیبا ہے، اس سے توبہ کرو ورنہ ذبح کر دونگا[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شطحیات صوفیہ سے کتنی دور تھے،

**حارث کا عہد مع اللہ** جنید بغدادی جو محاسبی کے ارشد تلامذہ میں ہیں، فرماتے ہیں کہ حارث زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دن میں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا تھا کہ وہ وہاں سے گذرے، میں نے ان کے چہرے پر بھوک کا شدید اثر محسوس کیا اور عرض کی چچا جان اگر آپ غریب خانے میں تشریف لاکر ماحضر تناول فرمائیں تو میری خوش قسمتی ہوگی، حارث نے کہا کچھ کھلاؤ گے؟ میں نے جواب دیا، میرے لئے یہ خدمت سعادت کا باعث ہے، اس گفتگو کے بعد ہم دونوں مکان میں آئے میں اپنے چچا کے گھر سے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے میوہ جات سے ہر وقت بھرا رہتا تھا، بہترین قسم کے کھانے اور پھل چن کر لایا، حارث نے اس میں سے ایک لقمہ اٹھایا اور اس کو چباتے رہے، مگر نگل نہ سکے اس کے بعد اکبارگی کھڑے ہوگئے، اور مجھ سے کچھ کہے بغیر ہی روانہ ہو گئے،

دوسرے روز پھر ان سے ملاقات ہوئی، میں نے عرض کیا چچا جان کل آپ نے مجھکو خوش کرکے پھر ناراض کر دیا، حارث نے فرمایا صاحبزادے بھوک تو شدید تھی اور میں نے کوشش بھی کی کہ تمھارے لائے ہوئے کھانوں میں سے کچھ کھالوں، مگر اللہ جل شانہ سے یہ میرا عہد ہے کہ اگر کھانا مشتبہ ہوتا ہے تو اس کی بو میرے شامہ میں پہونچ جاتی ہے پھر میرا جی کھانے کو ہرگز نہیں چاہتا، چنانچہ لقمہ میں نے تمھاری دہلیز ہی میں ڈال دیا تھا،

[1] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۴۹۵،



قشیری نے اس واقعہ میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ میں نے عرض کیا، اچھا آج سہی، حارث تیار ہوگئے میں نے گھر میں جو روٹی کے سوکھے ٹکڑے پڑے تھے وہ جمع کرکے سامنے رکھدیئے، انھوں نے اسکو تناول کیا اور فرمانے لگے، جب کسی فقیر کے سامنے کھانا پیش کرو تو ایسا ہی ہونا چاہئے!

ابن خلکان نے یہ واقعہ دوسرے انداز سے نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں،،

"حارث محاسبی سے مروی ہے کہ جب وہ کسی کھانے کی جانب ہاتھ بڑھاتے اور اس میں کسی قسم کا شبہ ہوتا تو انگلیوں کی ایک رگ پھڑکنے لگتی اور وہ اس سے ہاتھ کھینچ لیتے"[1]

**طہارت کے اقسام** اسلام نے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتوں کو اہمیت دی ہے، مگر طہارت باطن کی اہمیت زیادہ رکھی ہے، سلف صالحین ظاہری طہارت میں تدقیقات کو اچھا نہیں سمجھتے اور پاکی و ناپاکی میں کرید کرنا ناپسند کرتے تھے، بلکہ اس سے روکتے بھی تھے،

حضرت عمرؓ فاروق ایک قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ جا رہے تھے، عرب کے پہاڑی علاقوں میں کہیں کہیں آبشار ہوتے ہیں، ایک مقام پر ایک آبشار کا پانی حوض میں جمع کر دیا گیا تھا، جب قافلہ وہاں پہنچا تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے مالک حوض سے پوچھا کہ تمھاری حوض پر درندے آکر پانی پیتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہرگز نہ بتانا اور فرمایا، "وہ اپنے وقت میں آتے ہونگے، اب ہماری باری ہے"[2]

لیکن طہارت باطنی میں حلت و حرمت کا معاملہ ہوتا ہے، اس لئے اسلاف اس میں بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ ایک مرتبہ مکان میں تشریف لائے تو دودھ پیش کیا گیا، آپ نے نوش فرمالیا، بعد میں معلوم ہوا کہ دودھ مشتبہ تھا، تو انگلی سے قے کر ڈالی، اور فرمایا، "ابو بکر کی موت آجائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں جلے"

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ اجتناب مشتبہات میں سلف صالحین کا کیا طریقہ رہا ہے،

[1] وفیات ج ۱ ص ۳۴۸، [2] موطا امام محمد باب الوضوء مما یشرب منہ السباع و تلغ فیہ ص ۶۶،

اجتنابِ شبہات کے متعلق اس سے بھی عجیب واقعہ قشیری اور ابن خلکان نے نقل کیا ہے، کہ حارث محاسبی کو ستر ہزار درہم باپ کی میراث سے حصہ مل رہا تھا، مگر انھوں نے اس سے ایک پیسہ بھی نہ لیا، کیونکہ ان کے والد قدری خیال کے تھے، اس لئے محاسبی نے ان کا تمام مال شبہ سمجھکر حصہ لینا پسند نہیں کیا،

**خدائی دستگیری** کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل اللہ کی رہنمائی کیجاتی ہے، اس قسم کا محاسبی کا ایک واقعہ شعرانی اور مناوی نے نقل کیا ہے، کہ حارث کا بیان ہے کہ جب میں نے کتاب المعرفۃ لکھی تو مجھے یہ عجب ہوا کہ آج تک کسی نے ایسی کتاب نہیں لکھی، ایک روز میں شاداں و فرحاں اس کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس مکان میں داخل ہوا اور سلام کرتے ہی معرفتِ الٰہی کے متعلق سوال کیا کہ اللہ کا حق مخلوق پر ہے؟ یا مخلوق کا حق اللہ پر ہے؟

میں نے جواب دیا، اللہ کا حق مخلوق پر ہے!

سائل نے کہا: پھر تو اللہ جل شانہ کو خود اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنی چاہیے تھی تاکہ مخلوق کو معرفتِ خداوندی کا صحیح علم حاصل ہوتا!

میں نے کہا: نہیں مخلوق کا حق اللہ پر ہے!

سائل نے کہا، اللہ پاک ظلم کرنے سے بری ہے، یعنی جو بات انسانی دسترس سے باہر ہے، اس کا حکم نہیں دیتا،

اس کے بعد سائل چلا گیا، میں نے فوراً "کتاب المعرفۃ" کو پانی سے دھو دیا، اور عہد کیا کہ آئندہ معرفت میں کلام نہیں کرونگا،

---

۱ رسالہ قشیری ص ۱۵ و وفیات ج ۱ ص ۱۲۶، ۲ طبقات الکبری للشعرانی ج ۱ ص ۷۴، ۳ الکواکب الدریۃ فی طبقات الصوفیۃ ج ۱ ص ۲۰۹،



اسی قسم کا ایک واقعہ مشہور حنفی عالم قدوری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب ہے، ان کی مختصر درس نظامی کی اہم کتاب ہے بلکہ مرغینانی کی ہدایہ بھی ایک طرح اس کی شرح ہی کہی جاسکتی ہے، ان کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مختصر لکھنے کے بعد حج کیا، اور کتاب کا مسودہ بیت اللہ کے سامنے رکھکر دعا کی کہ خدایا اس میں مجھ سے جو فروگذاشتیں ہوگئی ہوں، ان پر مجھے کسی طرح آگاہ فرمادے، اس کے بعد مسودہ کھولا تو کئی جگہ عبارت محو شدہ ملی، وہ سمجھ گئے کہ وہ عبارتیں غلط مرقوم ہوگئی تھیں،

**وفات** خطیب اور ابن السبکی نے امام ابو ثور سے نقل کیا ہے کہ میں حارث کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھا، انھوں نے فرمایا، دیکھنا اگر سکرات میں مجھکو اچھا منظر نظر آیا تو میں ہنسوں گا ورنہ چہرے پر برے آثار ظاہر ہونگے، ابو ثور کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہنسے اور وفات پاگئے،

**ملفوظات** محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بڑے حکیمانہ ہوتے ہیں، چند ملفوظات نقل کئے جاتے ہیں، فرماتے ہیں

(۱) ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے، انسان کا جوہر اس کی عقل ہے، اور عقل کا جوہر توفیق (خداوندی) ہے، (دوسری روایت) عقل کا جوہر صبر ہے،

(۲) اس امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جن کو آخرت (کی فکر) دنیا سے غافل نہ کرے، اور دنیا (کی لالچ) آخرت سے غافل نہ کردے،

(۳) خلق حسن کا مطلب اذیت کا تحمل کرنا، غصہ کم کرنا، خندہ جبینی اور میٹھے بول ہیں،

(۴) جس نے نعمت خداوندی کا شکر ادا نہ کیا، اس نے بربادی کو خود ہی دعوت دیدی،

(۵) ہر زاہد کا زہد اس کی معرفت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور معرفت عقل کے اور عقل کو قوت ایمانی کے تناسب ہوتی ہے،

(۶) ظالم نادم ہوتا ہے خواہ لوگ اسکی مدح سرائی کریں، مظلوم خوش رہتا ہے، خواہ لوگ

---

۱ تاریخ بغداد و طبقات الشافعیۃ الکبری،

اس کی مذمت کریں، قانع مالدار ہوتا ہے، خواہ بھوکا رہے، اور لالچی فقیر ہوتا ہے، خواہ گنج و دولت کا مالک ہو جائے،

(۷) جو اپنے باطن کو اخلاص و مراقبہ سے سدھار لیتا ہے، اللہ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباع سنت سے آراستہ فرما دیتے ہیں،

(۸) جب کوئی انسان صلاح و تقوی سے آراستہ ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو خلق کی صلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں، اور جب کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو خلق کی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے،

(۹) عبودیت کا مطلب یہ ہے، کہ اپنے نفس کے اختیار کا خیال ہی باقی نہ رہے، یعنی تم سمجھو کہ میں اپنے نفع و ضرر کا مالک نہیں ہوں،

(۱۰) اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور اللہ پاک کے درمیان سے مخلوق کا واسطہ نکال دو اور یاد رکھو نفس انسانی بھی ایک بڑی مخلوق ہے، جبتک نفسانیت کو عمل سے خارج نہ کروگے اخلاص پیدا نہ ہوگا،

(۱۱) جو باطن کے لئے مجاہدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو حسن معاملہ کی توفیق عطا فرماتا ہے، اور جو حسن معاملہ اور باطنی مجاہدہ دونوں سے بہرہ ور ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کو وصول الی اللہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے، وَالَّذِینَ جَاهَدُوا فِینَا الخ

(۱۲) تین باتیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں، (۱) حسن ظاہری پاکدامنی کے ساتھ (۲) خلق حسن دیانت داری کے ساتھ، (۳) بھائی چارگی امانت داری کے ساتھ،

(۱۳) دنیا کا خیال رہتے ہوئے اس سے کنارہ کش رہنا زاہدوں کا طریقہ ہے، اور دنیا کو بالکل نسیا منسیا کر دینا عارفین کا مقام ہے،



**تصانیف** محاسبی کی تصانیف کی تعداد بعض روایتوں کے مطابق دو سو تک ہے، ان میں سے (۱) کتاب الرعایة لحقوق اللہ عزوجل، (۲) کتاب التوہم، (۳) رسالہ مسترشدین چھپ چکی ہیں، بعض غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، (۴) آداب النفوس (۵) شرح المعرفة (۶) البعث والنشور (۷) المسائل فی اعمال القلوب والجوارح (۸) المسائل فی الزہد وغیرہ (۹) ماہیة العقل ومعناه واختلاف الناس فیہ (۱۰) کتاب فی الدماء (۱۱) کتاب التفکر والاعتبار (۱۲) رسالة الوصایا (۱۳) بدء من اناب الی اللہ تعالیٰ، (۱۴) التنبیہ علی اعمال القلوب فی الدلالة علی وحدانیة اللہ (۱۵) رسالة المراقبہ (۱۶) القصد والرجوع الی اللہ تعالیٰ (۱۷) کتاب النصائح (۱۸) مختصر کتاب فہم الصلوٰة (۱۹) کتاب العظمة (۲۰) شرح المعرفة وبذل النصیحة (۲۱) المکاسب والورع والشبہہ، وبیان محظورہا واختلاف الناس فی طلبہا والرد علی الغالطین فیہا،

**تنقیدات** محاسبی پر تنقیدیں بھی کی گئی ہیں لیکن نہ سب کی سب درست ہیں نہ تمام لغو ناقابل التفات ہیں، اس لئے ان پر بھی ایک نظر ڈالی جاتی ہے،

ناقدین کی فہرست میں سب سے پہلا نام حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، گو ان کی تنقید ہلکی ہے، مگر ان کی عظمت شان کی وجہ سے اس کا اثر زیادہ ہوا، اس کے بعد محدث ابو زرعہ کا نام ہے، ان کا لب و لہجہ بہت سخت ہے مگر ان کی طبیعت تیز واقع ہوئی تھی، اس لئے لوگوں نے ان کی تنقید کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، تیسرا نام ابن العربی مالکی محدث و مفسر کا ہے، جو محاسبی کے مرتبہ شناس بھی ہیں اور ناقد بھی، اس لئے ان کی تنقید صحیح ہے،

**امام احمدؒ کی تنقید** امام احمدؒ نے محاسبی پر دو نقد کئے ہیں، پہلا تصوف کی راہ سے، دوسرا علم کلام کے اشتغال کی وجہ سے، خطیب نے تاریخ بغداد میں ایک واقعہ لکھا ہے،

اسمٰعیل بن اسحٰق سراج کہتے ہیں مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا، مجھے اطلاع ملی ہو کہ حارث محاسبی

تمھارے گھر بہت آتے جاتے ہیں، تم ان کو اپنے یہاں بلاؤ اور مجھے اس طرح کہیں بٹھا دو کہ ان کی باتیں سن سکوں، مجھے امام احمد کی یہ خواہش پسند آئی، میں اٹھ کر سیدھا حارث محاسبی کے پاس پہنچا اور عرض کی حضرت آج رات غریب خانہ پر تشریف لائیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ساتھ لائیں، محاسبی نے فرمایا میرے شاگرد بہت ہیں، اس لئے تمھیں دعوت کرنے میں دشواری پیش آئیگی، اس لئے تم کھجور اور کھلی کے علاوہ کوئی اور اہتمام نہ کرنا، میں نے انکی پوری تعمیل کی،

محاسبی کو مدعو کرنے کے بعد میں امام احمدؒ کے پاس گیا، اور ان کو اطلاع کر دی، امام احمدؒ مغرب کے بعد تشریف لائے اور بالاخانے کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے، ان کے بعد حارث محاسبی اور ان کے تلامذہ بھی آگئے، کھانا کھانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھی، نماز کے بعد سب حارث کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گئے، اسی طرح آدھی رات گذر گئی، اس کے بعد ایک شاگرد نے کوئی سوال کیا حارث نے اس پر تقریر کی تمام تلامذہ خاموشی سے سنتے رہے پھر کوئی رونے اور کوئی چیخیں مارنے لگا مگر حارث بدستور تقریر فرماتے رہے، میں اس درمیان میں بالاخانے پر گیا، تو دیکھا کہ امام احمدؒ روتے روتے بیہوش ہوگئے ہیں، میں واپس چلا آیا، یہ منظر صبح تک قائم رہا، صبح ہوتے ہی حارث اور ان کے تلامذہ منتشر ہوگئے، میں دوبارہ بالاخانہ پر گیا تو امام احمد متغیر الحال تھے، میں نے عرض کی حضرت! ان لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ان کے جیسے لوگوں کو کبھی دیکھا ہو، اور نہ حقائق و معرفت میں ایسی تقریر سنی، اب میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ تمھارا ان کی صحبت میں رہنا اچھا نہیں ہے،[1]

اس واقعہ میں امام احمدؒ نے محاسبی کے کمال کا اعتراف بھی کیا ہے اور سراج کو ان کی صحبت سے بچنے کی ہدایت بھی کی ہے، اسکی توجیہ میں حافظ ابن حجر اور علامہ تاج السبکی لکھتے ہیں،

| | |
|---|---|
| انما نهاه احمد عن صحبتهم لقصوره عن مقامهم فانهم في مقام ضيق لا يسلكه كل احد ويخاف على من يسلكه ان لا يوفيه حقه،[1] | اسمٰعیل سراج محاسبی کے مقام سے فروتر تھے، اس لئے امام احمدؒ نے ان کی صحبت سے منع فرمایا، نیز محاسبی کی راہ بہت کٹھن تھی ہر شخص کا یہ دل گردہ نہیں کہ اس پر چل سکے، اس لئے خطرہ تھا کہ وہ اس راہ کا صحیح حق ادا نہ کر سکیں گے اسلئے ان کو روکا |

۱؎ تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۲۰،



حافظ ابن کثیر نے بھی ممانعت کی پہلی وجہ تو یہی لکھی ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری توجیہ بھی فرمائی ہے،

| | |
|---|---|
| يحتمل ان احمد كره له صحبتهم لان الحارث بن اسد وان كان زاهدا فانه كان عنده شئ من الكلام وكان احمد يكره ذلك[2] | یہ بھی ممکن ہے کہ محاسبی اگرچہ زاہد تھے لیکن علم کلام سے اشتغال رکھتے تھے جو امام احمد کو پسند نہ تھا، اس لئے اسمٰعیل سراج کو ان کی صحبت اختیار کرنے سے منع فرما دیا ہو، |

اس کے بعد اپنی ذاتی رائے لکھتے ہیں۔

"میری رائے یہ ہے کہ امام احمدؒ نے اس لئے منع فرمایا کہ محاسبی اور ان کے اصحاب کے کلام میں تقشف اور سختیاں تھیں، جس کا شرع متین نے حکم نہیں دیا ہے، نیز وہ لوگ دین میں باریکیاں نکالا کرتے تھے، شریعت نے اس کا حکم بھی نہیں دیا ہی، چنانچہ جب ابو زرعہ محدث کے سامنے ان کی کتاب الرعایۃ لائی گئی تو انھوں نے فرمایا یہ بدعت ہی، اور کتاب لانے والے کو ہدایت فرمائی کہ تم کو مالک، ثوری، اوزاعی اور لیث کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اس کتاب کو ترک کر دو اس لئے کہ یہ بدعت ہے"[3]

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۳۶ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۴۰ ۲؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۰،

یہ بھی ممکن ہے کہ امام احمد اپنا اور محدثین کا طریقہ اچھا سمجھتے ہوں اور اس میں سالک کے لئے امن و حفاظت زیادہ سمجھتے ہوں، اس لئے سراج کو محاسبی کی مجالست ترک کرنے کی ہدایت فرمائی۔[1]

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ گو ابن کثیر، تاج الدین ابن السبکی، حافظ ابن حجر اور خطیب بغدادی وغیرہ نے نقل کیا ہے مگر حافظ ذہبی نے اس پر جرح بھی فرمائی ہے، وہ "میزان الاعتدال" میں لکھتے ہیں:

هذه حكاية صحيحة السند، منكرة لا تقع على قلبي، استبعد وقوع هذا من مثل احمدؒ،

اس واقعہ کی سند صحیح ہے، مگر خود واقعہ ناقابل قبول ہے، میرا دل اس پر مطمئن نہیں اور میں امام احمدؒ جیسے شخص سے اس

امام احمدؒ کا دوسرا نقد علم کلام سے محاسبی کے اشتغال کی وجہ سے تھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

وكان احمد بن حنبل يكره للحارث نظره في الكلام وتصانيفه الكتب فيه ويصد الناس عنه[2]

حارث کا علم کلام سے اشتغال اور اس فن میں ان کی تصنیفات امام احمد کو ناپسند تھیں اور وہ لوگوں کو اس سے[2]

ابن السبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے:-

"امام احمد علم کلام سے اشتغال رکھنے والوں پر کڑی تنقید فرمایا کرتے تھے، اس خیال سے کہ اس کی وجہ سے لوگ غلط راہ پر نہ جا پڑیں، اور یہ واقعہ ہے کہ بلا ضرورت علم کلام میں گفتگو کرنے سے اجتناب ہی اولیٰ ہے، اور جب تک ضرورت نہ ہو اس میں گفتگو کرنا بدعت ہے، حارث محاسبی نے بھی علم کلام سے کچھ مباحث میں کلام فرمایا تھا، ابوالقاسم نصرآبادی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ امام احمد نے اسی وجہ سے حارث کا بائیکاٹ کر دیا تھا"[3]

[1] مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۶، [2] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۴،
[3] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۹،



تاج الدین ابن السبکی کی رائے یقیناً قابل عمل ہے، مناوی نے بھی جامع صغیر سیوطیؒ کی شرح فیض القدیر میں لکھا ہے:-

"ابن عربی (صوفی فلسفی) فرماتے ہیں، علم کلام کی عظمت شان کے باوجود بہت سے لوگوں کو اس کی قطعاً حاجت نہیں ہے، شہر میں ایک شخص علم کلام کا ماہر کافی ہے، اس کے برخلاف فروعات دین کے علماء کا بکثرت ہونا ضروری ہے، اگر کوئی مر جائے اور اس کو علماء نظر و فکر کی اصطلاحات معلوم نہ ہوں کہ جوہر، عرض، جسم و جسمانی اور روح و روحانی کیا ہوتا ہے، تو اس کی باز پرس نہ ہوگی، البتہ لوگوں سے فروعات و اعمال کا ضرور سوال ہوگا"[1]

**مذکورہ تنقید کا پس منظر**

لیکن جب لوگوں میں عقائد کی خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں تو سالکین کی اصلاح کے لئے اس کی اصلاح اہم چیز ہو جاتی ہے، جب تک مسترشدین کا عقیدہ صحیح نہ ہوگا، اصلاح کا صحیح ثمرہ رونما نہ ہوگا، چنانچہ جب مسلمانوں میں فلسفۂ یونان منتقل ہوا، اور بہت سے عجمی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی بنیاد پر تیشہ زنی کرنے لگے تو صوفیا خصوصاً حارث محاسبیؒ علیہ الرحمۃ نے اصلاح خلق کا طریقہ یہی سوچا کہ لوگوں کے عقائد کی پہلے اصلاح کی جائے اور عمل کی اصلاح کو دوسرا نمبر قرار دیا جائے، اس کے لئے انھوں نے علم کلام میں تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا، حارث رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ذاتی تجربہ تھا، کیونکہ ان کے والد قدری تھے، لیکن محدثین کی ایک جماعت اس طریقہ کو ناپسند کرتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ اس طریقۂ اصلاح میں جس طرح سدھرنے کا احتمال ہوتا ہے، بھٹکنے کا بھی ہوتا ہے، اس لئے اصلاح اعمال حسنہ کے پہلو سے ہونی چاہئے، اسی خیال کے پیش نظر وہ لوگ پہلے طریقہ والوں پر کڑی تنقید فرمایا کرتے تھے، حارث محاسبی پر امام احمدؒ نے جو تنقید فرمائی ہے وہ بھی اسی کے تحت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا مقصد نیک اور مقصود

[1] فیض القدیر ج ۴ ص ۴۳۱، [2] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۵ و وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۹،

ایک ہے کہ عباراتنا شتی و حسنک واحد

**امام احمد کی تنقید کا اثر** خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ چونکہ بغداد میں امام احمد کا اثر و رسوخ تھا اس لئے[1] ان کی تنقید کا اثر یہ ہوا کہ حارث محاسبی کو روپوش ہو جانا پڑا، اور اسی حالت میں ان کی وفات بھی ہوگئی، صرف چار آدمی نے ان کی نماز جنازہ ادا کی[2]

**واقعہ کی اصلیت** لیکن حافظ ذہبی نے اس واقعہ پر بھی جرح فرمائی ہے، وہ میزان میں لکھتے ہیں کہ[3]

ھذہ حکایۃ منقطعۃ، یہ واقعہ سند متصل سے ثابت نہیں ہے،

**محدث ابوزرعہ کی تنقید** ابوزرعہ محدث کی تنقید کا نہج عجیب ہے، خطیب نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن عمرو بردعی سے نقل کیا ہے،

"بردعی کہتے ہیں میں مجلس میں تھا کہ ابوزرعہ سے محاسبی اور ان کی تصنیفات کے متعلق سوال کیا گیا، ابوزرعہ نے سائل سے فرمایا تم کو ان کی کتابوں سے اجتناب کرنا چاہئے، وہ بدعت و ضلالات کا مجموعہ ہیں، تم کو نقل و آثار پر قناعت کرنا چاہئے یہ حارث کی کتابوں کا نعم البدل ہیں"

پوچھا گیا، محاسبی کی کتابوں میں عبرت کی باتیں بھی ہوتی ہیں؟

ابوزرعہ نے فرمایا جس کو قرآن پاک میں عبرت نظر نہ آئے اس کو ان کتابوں میں کیا عبرت نظر آئیگی؟ کیا تم بتلا سکتے ہو کہ مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی، اور ائمہ متقدمین نے خطرات و وساوس اور عیوب نفسانی کی اصلاح کے متعلق کوئی تصنیف کی ہے، صوفیا اہل علم کے طریق کے خلاف جارہے ہیں، وہ کبھی حارث محاسبی کو پیش کرتے ہیں، کبھی عبدالرحیم دیبلی کو کبھی حاتم اصم کو کبھی شفیق بلخی کو، تعجب ہے کہ کس قدر جلد یہ لوگ بدعات

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۵ [2] وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۹ [3] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۹۹



کی طرف بڑھے جارہے ہیں![1]

**ابوزرعہ کی تنقید کی وجہ** اس زمانہ میں جب محدثین کا دور دورہ تھا وہ جب اپنے طور و طریق سے کسی کو ہٹا ہوا دیکھتے تو اس پر کڑی سے کڑی تنقید کرتے تھے، اس کی ایک مثال معجم الادباء میں یاقوت نے امام شافعی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مصعب بن زبیر کہتے ہیں کہ میرے والد اور امام شافعی کبھی کبھی شعر خوانی کیا کرتے تھے، ایک روز امام شافعی نے ہذیل کے اشعار سنائے اور فرمایا کسی اہل حدیث سے اسکا ذکر نہ کرنا کیونکہ وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتے[2]

امام احمد اور محدث ابوزرعہ کی تنقید بھی اسی قبیل کی ہے، خصوصاً ابوزرعہ کے مزاج شناس کو یہ تنقید قطعاً عجیب معلوم نہ ہوگی بلکہ وہ اس کو ہلکی ہی سمجھیں گے، امام ابوحنیفہ پر جو تنقیدات کی گئی ہیں اسکو بھی اسی آئینہ میں دیکھ لینا چاہئے،

**تنقید کی ایک اور وجہ** مذکورہ بالا وجوہ کے علاوہ حافظ ابن رجب حنبلی نے اس کی ایک اور وجہ بیان فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"امام احمد وغیرہ نے وساوس و خطرات نفسانی کے متعلق گفتگو کرنے والے صوفیا پر اس لئے تنقید کی ہے کہ ان کی گفتگو اور بحث کسی دلیل شرعی پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ محض رائے اور ذوق ان کی دلیل ہوتی ہے تو جس طرح علم حلال و حرام میں محض ظن و قیاس سے بلا دلیل شرعی گفتگو کرنا مذموم ہے، اسی طرح امام احمد وغیرہ صوفیاء کے اس طریقہ کو بھی مذموم سمجھتے تھے"[3]

مگر اس کو تنقید کا سبب بنانا چند وجوہ سے غلط ہے، (۱) یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس پر اتنی کڑی تنقید کی جائے، (۲) علم حلال و حرام اور فروعات دین کا مقام اور ہے اور وساوس

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۵ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۶۱ [3] جامع العلوم والحکم ابن رجب حنبلی ص ۳۲۲

وخطرات نفسانی کا پتہ لگا کر ان کا علاج بتانا دوسری حیثیت رکھتا ہے، دونوں کو ایک پلہ میں رکھنا مناسب نہیں ہے، (۳) بڑے بڑے صوفیا جب اس موضوع پر کلام کریں گے تو ان کے لئے ہر بات کی دلیل لانا مشکل ہو جائیگا، وہ ایک بات بتلائیں گے جس کا جی چاہے مانے جس کا جی نہ چاہے نہ مانے البتہ علم حلال وحرام کے معاملہ میں بلا دلیل شرعی لب کشائی کرنا جرم عظیم ہے اور اس کا ماننا ضروری ہے،

تیسرا نقد | بعض ناقدین نے محاسبی پر ایک اور گرفت کی ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں احادیث ضعیفہ بلکہ موضوعات تک لاتے ہیں، اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان پر اعتماد کرکے ان کو اصول قرار دے دیتے ہیں، چنانچہ ابو بکر بن العربی مالکی جو محاسبی کے بڑے مداح ہیں ان پر تنقید کی ہے، ترمذی شریف کی حدیث "الحلال بین والحرام بین الخ" کی شرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس حدیث کی شرح میں جن علماء نے لب کشائی کی ہے ان میں جلیل القدر کبیر الشان عالم حارث بن اسد محاسبی ہیں، انھوں نے عطیہ سعدی کے اس قول کو جو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یترک مالا بأس بہ مخافۃ ما بہ بأس" (کوئی شخص حقیقی پرہیزگار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مباحات کو محظورات کے خطرے کی وجہ سے ترک نہ کردے) اور اس قبیل کی دوسری روایات و آثار کو اصول بنا دیا ہے اور اس پر طویل کلام فرمایا ہے، ان کی پوری بحث تکرار کے باوجود افادہ سے خالی نہیں ہے، انھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے بالکل بجا ہے، کاش وہ احادیث ضعیفہ سے تعلق نہ رکھتے، اور ان کو اپنے اصول کا مبنیٰ نہ قرار دیتے،

اگر علمائے حدیث کو اس سے واقفیت ہو جائے تو وہ ان کا مذاق اڑائیں حالانکہ محاسبی فن حدیث کے چوٹی کے ائمہ سے ملاقات رکھتے ہیں، جیسے ابو بکر بن شیبہ وغیرہ،



اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے جو امام احمد سے مروی ہے کہ ورع وتقویٰ کے باب میں نرم ضعیف احادیث لانا جائز ہے،

لیکن اللہ تعالیٰ امام بخاری پر رحمت نازل فرمائے جن کا مطمح نظر یہ تھا کہ مومن کا قلب صرف صحیح احادیث کے ساتھ مربوط ہونا چاہئے، اور دین کا مدار صرف قوی احادیث پر رکھا جائے، ہمارا بھی یہی خیال ہے، اور اگر ہم امام احمد کے مذہب کو بھی لیں تو ہمارے نزدیک ضعیف احادیث کا لانا صرف مواعظ وعبر میں تو صحیح ہو سکتا ہے، مگر اصول دین میں ان کو لانا کسی طرح روا نہیں ہے"[1]

محاسبی پر جن بزرگوں نے تنقید کی ہے ان میں صحیح تنقید صرف ابن العربی کی ہے، کیونکہ محاسبی کی ہر تصنیف اس قسم کی احادیث سے مملو نظر آتی ہے، رسالۃ المسترشدین میں بھی کئی احادیث اس قسم کی ہیں، جو ضعیف یا موضوع ہیں، اس کے علاوہ وہ اپنی تصانیف میں اسرائیلیات بھی لاتے ہیں تصوف ورقاق میں سب سے پہلے مصنف محاسبی ہیں، اس لئے ان کے اس غلط طرز کا اثر بڑا دوررس ثابت ہوا، ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور امام غزالی کی احیاء العلوم وغیرہ کتب تصوف میں جو اس قسم کی احادیث ملتی ہیں اس کا سبب محاسبی کا تسامح ہے، انھوں نے اس قسم کی روایات کو اپنی تصنیفات میں جگہ دی، اسلئے بعد کے آنے والوں نے انکی اتباع میں ان احادیث کو اپنی اپنی تصنیفات میں درج فرما دیا اور اس طرح محاسبی خود اپنے ہی ملفوظ کا مصداق بن گئے کہ

"جب بھی کوئی انسان صلاح وتقویٰ سے ہمکنار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو ایک خلق کے صلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں اور جب کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو ایک خلق کی گمراہی کا سبب بنا دیتے ہیں"

اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے محاسبی اور انکے متبعین کی اس فروگذاشت سے درگذر فرمائے، وما ذالک علی اللہ بعزیز

[1] عارضۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی مصری جلد ۹ ص ۲۰۱،

# معانی الآثار امام طحاوی

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

یہ امام طحاوی کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، جو ان کے علمی کمالات، فقہ و اجتہاد میں بصیرت، حدیث اور رجال میں ژرف نگاہی، کثرت مطالعہ اور وسعت نظر کا بے مثال نمونہ ہے۔

اہمیت | معانی الآثار کو حدیث کی کتابوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں اور یہ جس درجہ حدیث کی کتاب ہے، اسی درجہ فقہ کی بھی ہے، اکابر علمائے حدیث نے اس کی مدح و تحسین کی ہے، علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہمپایہ قرار دیا ہے[1]، امیر اتقانی کا بیان ہے کہ "اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت و شان اور بلند پایگی میں کلام ہو تو سے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذاہب میں بھی ایسی مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی[2]"، مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابو داؤد کے قریب قریب ہے، کیونکہ اس کے تمام رواۃ معروف و مشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور پھر ابن ماجہ کا درجہ ہے[3]"، مولانا عبد الرشید نعمانی نے علامہ عینی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ

"امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پُر از منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اسے حدیث کی اکثر مشہور و مقبول کتابوں سے بھی راجح پائیگا"

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۲۸ [3] فیض الباری ج ۱ ص [illegible]



سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیونکہ اس کے اندر وجوہ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں، اور ناسخ و منسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے، اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اسکے بعض رجال ضعیف اور مرتبہ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے، بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دار قطنی بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کے مخفی رہنے کا سبب یہ ہوا کہ وہ عام لوگوں کے ہاتھ نہیں لگی، اسلئے وہ اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کر سکے اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کر سکے، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشہ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بیخبر رہے[1]"، ان اقوال سے معانی الآثار کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

موضوع اور مقصد تالیف | امام طحاوی نے خود لکھا ہے کہ "مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات و آثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ و منسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم کہ ان میں تضاد و اختلاف ہے، دور ہو جائے، اس لئے اس کتاب میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور واجب العمل روایات نیز علماء کی تاویل و توجیہ، ان کے دلائل و شواہد اور مرجح و مختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل اور وجوہ بھی نقل کئے گئے ہیں، اور اس کی تائید میں کتاب و سنت، صحابہ و تابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ان مباحث میں غور و خوض

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۰

بحث و تفتیش اور تلاش و تحقیق میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا،[1]

کتاب کی نوعیت اور اس کے مباحث میں کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ حسب ذیل تلخیص سے کیا جا سکتا ہے:

**وضو میں سر کے مسح کی فرضیت کا مسئلہ**

وضو میں سر کا مسح فرض ہے لیکن یہ اختلاف ہے کہ سارے سر کا مسح کیا جائیگا یا صرف بعض حصہ کا، امام طحاوی نے پہلے ان روایتوں کو نقل کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے سر کا مسح فرض ہے، اس کے بعد وہ ان پر تبصرہ کرتے ہیں،

" ان احادیث کی بنیاد پر بعض لوگوں کے نزدیک سارے سر کا مسح فرض ہے، اگر کوئی حصہ چھوٹ گیا تو وضو درست نہیں ہوگا، مگر دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہم کو بھی یہ تسلیم ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا چاہئے لیکن اسکی فرضیت میں کلام ہے، کیونکہ رسول اللہ صلعم کے عمل سے اسکی کوئی دلیل فراہم نہیں ہوتی، آپ سے وضو میں اعضا کو تین تین مرتبہ دھونا بھی ثابت ہے لیکن آپ یہ اس بنا پر نہیں کرتے تھے کہ تین تین بار دھونا فرض ہے، اور اس سے کم دھونا کافی نہیں ہے، بلکہ صرف افضلیت کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، اسی طرح پورے سر کا مسح کرنا اولیٰ ہے لیکن اگر پورے سر کا مسح نہ کیا جائے تو بھی وضو ہو جائیگا کیونکہ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سر کے بعض حصہ کا مسح کافی اور ضروری ہے،

اس کے بعد انھوں نے اس مفہوم کی جملہ مرویات نقل کی ہیں اور ان کے اسناد و متون اور مدلول و منشا پر تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ بعض حصہ کا مسح کرنا ہی فرض ہے، باقی جن روایتوں میں پورے سر کے مسح کا ذکر ہے، ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے سر کا مسح اولیٰ و افضل ہے نہ کہ فرض و واجب،

یہاں تک تو مجرد آثار و احادیث کی روشنی میں مسئلہ کی توضیح و تنقیح کی گئی تھی اور یہ دکھایا گیا تھا کہ اس باب کی حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، آخر میں وہ عقلی اور نظری حیثیت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ سر کے بعض ہی حصہ کا مسح فرض ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

---

[1] معانی الآثار ج ۱ صـ ،



وضو میں بعض اعضا کا دھونا اور بعض کا مسح کرنا فرض ہے، اعضاء مغسولہ چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ہیں، ان کے بارہ میں عام اتفاق ہے کہ جس حد تک دھوئے جانے کا حکم دیا گیا ہے اس حد تک دھونا فرض ہے، اگر ان میں ذرا بھی کمی کی گئی تو وضو درست نہ ہوگا، اعضا ممسوحہ میں سر اور ضعیف قول کے مطابق پاؤں بھی داخل ہیں، سر کے بارہ میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے اعضاء مغسولہ پر قیاس کرکے سارے سر کا مسح فرض بتایا ہے حالانکہ اعضاء مغسولہ پر ممسوحہ کا قیاس غلط ہے، البتہ اسکو مسح علی الخفین پر قیاس کرنا چاہئے، گو اس کے متعلق بھی کسی قدر اختلاف ہے، تاہم فی الجملہ سب متفق ہیں کہ بعض حصہ کا مسح کر لینا درست اور کافی ہے، ایسی حالت میں قیاس و نظر کا تقاضا یہ ہے کہ مسح راس کا حکم بھی خفین کے مسح کی طرح ہو یعنی بعض حصہ کا مسح کر لینے سے فرضیت ادا ہو جائیگی تاہم اولیٰ اور افضل سارے سر کا مسح کرنا ہے، یہی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا مسلک ہے، اور صحابہ و تابعین کے عمل سے اسکی توثیق ہوتی ہے، امام زہری سالم سے اور وہ اپنے والد حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ "انه كان يمسح بمقدم راسه اذا توضاء"[1]

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا عام انداز بیان اور طریقہ تصنیف یہ ہے کہ وہ اختلافی امور و مسائل میں پہلے مرجوح مسلک کی مؤید روایات نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس مختلف اور مرجح مسالک کی حدیثیں اور ان کے مؤیدات ذکر کرکے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کی تائید میں دلائل و ثبوت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے، اور ان میں مکمل تطبیق بھی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً اس بحث میں جس کی تلخیص کی گئی ہے انھوں نے دونوں قسم کی روایتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن ان کے محمل کی ایسی تعین کی ہے جو روایات اور قیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے اور آخر میں احناف کے ائمہ ثلاثہ کا مسلک بیان کرکے اس کی تائید میں صحابہ و تابعین کے آثار پیش کئے ہیں، (معانی الآثار ج ۱ ص ۱۷، ۱۸)

امام طحاوی کا یہ مختلف و متضاد روایات میں تطبیق کا ایک اصول تھا، اس اصول کے مطابق انھوں نے ان روایات کو اولیٰ اور غیر اولیٰ پر محمول کرکے ان کے ظاہری اختلاف و تضاد کو دور کیا ہے،

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بعض روایات ناسخ اور بعض منسوخ ہوتی ہیں، لیکن عدم واقفیت کی بنا پر ظاہر بین نگاہوں کو ان میں تضاد نظر آتا ہے، ایسے موقع پر امام طحاوی بحث و تنقیح کے بعد دلائل کی روشنی میں ناسخ و منسوخ میں امتیاز کرکے دکھلاتے ہیں کہ اس باب میں کوئی تضاد نہیں،

تیسرا اصول یہ ہے کہ مطلق و مقید یا مجمل اور مفصل اور خاص و عام روایات کا خیال نہ کرنے کی وجہ سے ان میں تناقض نظر آتا ہے، اس لئے امام طحاوی نے مطلق و مقید، مجمل اور مفصل اور خاص و عام روایات کی تعیین و توجیہ کرکے دکھایا ہے، کہ فی الواقع ان میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں ہے،

چوتھا اصول یہ ہے کہ اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو تحقیق و تنقیح کے بعد صحیح اور قوی روایات کو تسلیم کیا جائیگا، اور ضعیف اور کمزور حدیثوں کو مناسب توجیہ نہ ہونے کی صورت میں رد کر دیا جائیگا،

پانچواں طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اصول اور کلیات شرع کی روشنی میں احادیث کا جائزہ لیکر ان کی ایسی تاویل و توجیہ کی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے،

چھٹا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر روایت کے مقابلہ میں غیر متواتر حدیث کو ساقط قرار دیا جائیگا،

امام طحاوی نے روایات کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے یہ جو چند اصول اختیار کئے ہیں، ان میں سے کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو ترک حدیث کا باعث ہو کیونکہ انھوں نے جن روایات کو ساقط بھی کیا ہے ان کو مکمل تحقیق و تنقیح کے بعد صریح اور واضح دلائل کے بعد کیا ہے،

امام طحاوی نے اس کتاب میں زیادہ تر اکابر احناف یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسف اور



امام محمد رحمہم اللہ کے مسلک کو ذکر کرنے کا التزام کیا ہے، لیکن دوسرے فقہا مثلاً احناف میں امام زفر، اور دوسرے مذاہب میں امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ کے مسالک کی بھی کہیں کہیں تصریح کی ہے، اور بعض مسائل کے متعلق بتایا ہے، کہ وہ متفق علیہ ہیں، صحابہ میں جن بزرگوں کے مسلک نقل کرتے ہیں اُن کے نام یہ ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ، اور تابعین میں سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، نافع مولیٰ ابن عمر، خارجہ بن زید، عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمرؓ، سالم بن عبد اللہ، عمر بن عبد العزیزؒ، قاسم بن محمد، عروۃ، ابن شہاب، عبد الرحمٰن اعرج، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، شعبی اور طاؤس وغیرہ،

امام طحاوی حنفی ہونے کے باوجود خود مجتہد اور صاحب فقہ تھے، عام طور پر اُن کو مجتہد منتسب اور مجتہد فی المذہب تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے انھوں نے مختلف فیہا مورد مسائل میں محاکمہ کرکے مرجح و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے، اکثر وہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام اعظم اور صاحبین کے مسلک کو جن کے اقوال عموماً انھوں نے نقل کئے ہیں، ترجیح دیتے ہیں، لیکن اگر اُن میں خود کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے تو اُن میں سے کسی ایک کے مذہب کو تحقیق و استدلال کے بعد ترجیح دیتے ہیں مثلاً بلی کے جھوٹے کو امام اعظم مکروہ بتاتے ہیں، لیکن صاحبین کے نزدیک اس میں کوئی کراہت نہیں، امام طحاوی نے اپنے اصول اور طریقہ بحث کے مطابق ہر فریق کے دلائل اور اُن کے مستدلات کی تفصیل بیان کرکے صاحبین کے مسلک کو مرجوح اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے،[1]

---

[1] معانی الآثار جلد اول ص ۱۱ و ۱۲،

اسی طرح کبھی انھوں نے امام صاحب کے مقابلہ میں صاحبین کے مسلک کو مرجح بتایا ہے، جیسے صلوٰۃ کسوف میں امام صاحب سری قرأت کے اور صاحبین جہری قرأت کے قائل ہیں، امام طحاوی کے نزدیک بوجوہ صاحبین کا مسلک قوی ہے[۱]

اسی طرح کبھی صرف امام ابو یوسف اور کبھی صرف امام محمد اور کبھی امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف اور کبھی امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے مسلک کو مرجح بتایا ہے،

بعض مواقع پر وہ حنفی مذہب کے ان اساطین ثلاثہ کے مقابلہ میں اسی مذہب کے دوسرے ائمہ کے حق میں فتوی دیتے ہیں، مثلاً کتاب النکاح میں ایک جگہ امام زفر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| فھذا ھو النظر فی ھذا الباب | نظری حیثیت سے اس کے متعلق ائمہ |
| کما قال زفر لا کما قال ابو | ثلاثہ کے مقابلہ میں امام زفر کا مذہب |
| حنیفہ و ابو یوسف و محمد | قوی ہے، |
| رحمھم اللہ[۲] | |

بعض اوقات حنفی مذہب کے مقابلہ میں دوسرے ائمہ فقہ کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں، اور سب کے برعکس اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً طواف کی نماز کے متعلق ائمہ احناف کا خیال ہے کہ وہ ممنوع اوقات میں نہیں پڑھی جا سکتی، لیکن بعض علما، کے نزدیک عصر کے بعد اصفرار سے قبل اور فجر کے بعد طلوع سے پہلے پڑھی جا سکتی ہے، امام طحاوی دلائل عقل و نقل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں، کہ عطاء، ابراہیم، اور مجاہد کا مسلک جس کی بنیاد حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے مرجح اور بجا اور رجحان اسی جانب ہے سفیان ثوری کا بھی یہی خیال ہے گو ہمارے ائمہ ثلاثہ اس کے مخالف ہیں،[۳]

---

[۱] معانی الآثار ج اول صفحہ ۱۹۷، [۲] ایضاً جلد ۲ ص ۱۳، [۳] ایضاً ج ۱ ص ۳۹۷،



احناف پر ترک حدیث اور تقدیم قیاس کا الزام غلط ہے

علمائے احناف پر ایک عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ روایات کے مقابلہ میں قیاس و درایت کی ترجیح و تقدیم کے قائل ہیں، لیکن یہ اعتراض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، خود امام طحاوی صحیح و ثابت حدیث کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو مطلق اہمیت نہیں دیتے، اسی اصول کی بنا پر انھوں نے بعض مسائل میں اپنے مذہب کے ائمہ کے اقوال سے اختلاف کیا ہے، ایک جگہ صاحبین کے مسلک کی وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں،

| | |
|---|---|
| والقول الاول الذی ذھب | پہلا مسلک جس کو صاحبین نے اختیار |
| الیہ ابو یوسف و محمد رحمھما | کیا ہے، ہمارے نزدیک زیادہ صحیح ہے |
| اللہ اصح القولین عندنا لموافقتہ | اسلئے کہ وہ روایت رسول کے موافق |
| لما قد رویناہ عن رسول | اور مطابق ہے، |
| اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ اعلم،[۱] | |

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ فقہی حیثیت سے اس کتاب کا کیا پایہ ہے،

احادیث و روایات کی حیثیت سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے، روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں امام طحاوی نے بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے، محدثین کے یہاں روایات کو جانچنے اور پرکھنے کی جو کسوٹی ہے، اس کی روشنی میں انھوں نے احادیث کا مفصل جائزہ لیا ہے، اور جس طرح انھوں نے احادیث سے احکام و مسائل کا استخراج و استنباط کیا ہے، اسی طرح روایات کی چھان بین ان کے متون اور طرق کی معرفت اور رجال و رواۃ کی جانچ کی ہے، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز کا بھی ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، گو رجال وغیرہ کے متعلق زیادہ معلومات اس کتاب میں نہیں ہیں، کیونکہ مصنف کا اصل مقصود تو معارض و مختلف روایات میں جمع و تطبیق

---

[۱] معانی الآثار، ج دوم ص ۶۳،

اور توفیق کے لطیف و دقیق وجوہ بیان کر کے ان کے تضاد کو رفع کرنا اور وجوہ ترجیح اور طرق استدلال وغیرہ کا ذکر کر کے صحیح قول کو مستنبط کرنا ہے تاہم انھوں نے اصول حدیث اور رجال پر بھی محققانہ بحث اور روایت کے ارسال، انقطاع، وقف اور رفع و اتصال، صحیح و غلط، صالح و فاسد، غریب و معروف، ضعیف و قوی روایات کی نشاندہی کی ہے، اور اسناد و متون پر ناقدانہ بحث کر کے اُن کا حسن و قبح ظاہر کیا ہے، روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے حدیث کو پرکھا ہے، اور رجال کے خصائص و محاسن اور رذائل و نقائص پر روشنی ڈالی ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو اس سے حنفیہ اور خصوصاً امام طحاوی پر ترک حدیث کے الزام کی تردید بھی ہوتی ہے،

"تشہد کے متعلق جملہ صحابہ کی مرویات جن کو ہم بیان کر چکے ہیں، یہی ہیں، صرف حضرت عمرؓ کی حدیث جو گذر چکی ہے، اُن کے خلاف ہے گویا تشہد کے بارہ میں متواتر روایات موجود ہیں، اور اُن کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں، اس لئے ان متواتر روایتوں کی مخالفت کر کے کسی اور چیز کو اختیار کرنا درست نہیں ہے، البتہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت میں لفظ "مبارکات" کا اضافہ ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس اصول کی بنا پر کہ زائد کو ناقص کے مقابلہ میں اختیار کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے، ان کی روایت کو قابل ترجیح قرار دیا ہے، لیکن دوسرے علماء کا خیال ہے کہ ابن مسعودؓ ابن عمرؓ اور ابو موسیٰؓ کی روایات زیادہ بہتر ہیں، کیونکہ اُن کے طرق کے بالکل ٹھیک ہونے پر سب لوگوں کا اتفاق ہے، چنانچہ ابو الزبیر جو ابن عباسؓ کی روایت کے راوی ہیں، اعمش، منصور اور مغیرہ وغیرہ جنھوں نے ابن مسعودؓ کی حدیث بیان کی ہے برابر نہیں ہیں، اور نہ اُن کا پایہ ابو موسیٰ کی حدیث کے راوی قتادہ اور ابن عمر کی حدیث کے راوی ابو بشر کے برابر ہے، رہی یہ بات کہ اضافہ کو قبول کرنا لازمی ہے، چاہے راوی کتنے ہی کمتر درجہ کا ہو، تو ایمن بن نابل نے لیث کے واسطہ سے ابو الزبیر سے جو اضافہ بسم اللہ کا بیان کیا ہے، اس کو اختیار کرنا زیادہ ضروری تھا، اسی طرح



اس اضافہ کو بھی قبول کرنا ضروری تھا، جو ابو اسلم نے ابن زبیرؓ سے روایت کیا ہے، اس میں بھی بسم اللہ کا اضافہ ہے لیکن جب یہ اضافہ نامقبول ہے تو ابو الزبیر کا وہ اضافہ کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے، جو ابن عباسؓ کی روایت میں عطاء ابن ابی رباح کی روایت پر کیا گیا ہے جب کہ ابن جریج نے اس کی عطاء سے اور وہ ابن عباسؓ سے اس کی موقوفاً روایت بھی کرتے ہیں، اور ابو الزبیر اس کو سعید بن جبیر اور طاؤس سے اور یہ دونوں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً بیان کرتے ہیں، لیکن اگر یہ ساری حدیثیں ثابت بھی ہو جائیں، اور سب کی سندیں برابر بھی نکلیں جب بھی ان سب کے مقابلہ میں عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت سب سے بہتر اور احسن قرار پائیگی کیونکہ اس حد تک تو سب کا اتفاق ہے، کہ ثابت شدہ تشہد کے علاوہ کوئی اور تشہد نہیں پڑھا جا سکتا، کیونکہ تشہد کا ذکر سے خاص تعلق ہے، اب جن لوگوں نے تشہد کی روایت کی ہے تو انھوں نے عام طور پر حضرت ابن مسعود کی موافقت کی ہے، اگر کوئی شخص اُن کی مخالفت کرتا، اور ایسی چیز بیان کرتا ہے جو ابن مسعود کی روایت میں نہیں ہے تو اسی چیز کو قبول و اختیار کیا جا سکتا ہے، جس پر اتفاق ہو اور جس کو بیشتر لوگوں نے بیان کیا ہو لیکن کسی اختلاف کو قبول نہیں کیا جا سکتا ہے،

اس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس باب میں بڑے تشدد اور غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے، چنانچہ وہ اپنے شاگردوں کو واؤ تک کا لحاظ اور اہتمام کرنے کی تاکید کرتے تھے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے پوری اور مکمل ہم آہنگی برقرار رہے، دوسرے لوگوں کی اس درجہ احتیاط اور تشدد کا ہم کو علم نہیں، اس لئے ہم ابن مسعودؓ سے مروی تشہد کو دوسروں سے مروی تشہد کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔"[۱]

اس قسم کی متعدد فاضلانہ اور محققانہ بحثیں موجود ہیں لیکن انکو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے،

[۱] معانی الآثار جلد اص ۱۵۶ و ۱۵۷۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معانی الآثار حدیث و فقہ دونوں کی جامع ہے، اور امام طحاوی کا درجہ فقہ و حدیث دونوں میں بہت ممتاز تھا، معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں، مشہور مفسرین صحابہ و تابعین کے اقوال اور مختار و مرجح قرأت و تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے بھی مسائل کا استنباط و استخراج کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام و مشاہد وغیرہ کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، معانی الآثار ابواب و مباحث کی ترتیب اور انداز بیان کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے،

**خصوصیات**

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُن کا خلاصہ ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے، اس سے معانی الآثار کی اہم خصوصیات ایک نظر میں سامنے آجائیں گی،

(۱) اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا عدم تضاد ثابت کیا گیا ہے، اور جو حدیثیں باہم بظاہر مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں، اُن کی نہایت مناسب اور دلنشیں توجیہ و تطبیق بیان کی گئی ہے،

(۲) گو اساطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے مذاہب اور فقہی آراء کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور بعض مواقع پر دوسرے علماء کے نقطۂ نظر خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے،

(۳) اقوالِ مختلفہ کے درمیان موازنہ اور اُن کے دلائل و شواہد بیان کر کے مرجح مسلک کا ذکر بھی ہے جس سے مصنف کا تفقہ و اجتہاد ظاہر ہوتا ہے،

(۴) مختلف طرق اور تعدد اسناد کا ذکر، مبہم رواۃ کی نشاندہی، راوی کے شک و وہم، اضطرابِ اسناد، روایت کے رفع و اتصال، صحت، قوت اور تواتر و شہرت یا وقف و انقطاع، سقم، ضعف، شذوذ، اور تفرد وغیرہ کی تصریح، مجمل و مختصر کی تشریح، مشتبہ کی تمیز، ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، اور



خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

(۵) معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں،

(۶) وضع و ترتیب کی خوبی اور انداز بیان و طرز ادا کا حسن و دلآویزی وغیرہ،

**معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب**

معانی الآثار کے ان خصوصیات کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقی کا ہے، کہ انھوں نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں، مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، مگر احناف کے مسلک کی مؤید ہیں، تصویب کی ہے۔

لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امام طحاوی نے بعض ایسے مسائل میں احناف کے مسلک کی مخالفت بھی کی ہے، جو روایات کے مطابق نہیں ہیں، اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے، تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں :-

هذا العمری تحامل ظاهر
من هذا الامام فی شأن
هذا الاستاذ الذی اعتمده
اکابر المشائخ،[۱]

امام بیہقی کی اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علماء و شائخ نے اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے،

حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں :-

"امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور اُن کی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس

[۱] کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۴۶۰،

کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارہ میں کہی ہے"[1]

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ

"کسی عاقل اور منصف مزاج شخص کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام طحاوی نے قرآن و احادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے"[2]

امام بیہقی کی تردید میں علاء الدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے[3]

رہی یہ بات کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے صحاح کے مقابلہ میں معانی الآثار کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، تو اس کے متعلق مولانا عبد الحئی لکھنوی لکھتے ہیں:-

"میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا، جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجر کے بارہ میں کہی ہے کہ ان کا موطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور موطا کی صحت سے انکار کرنا صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے موطا میں اس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے جیسا امعان نظر بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو موطا کی اہمیت کا انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی، تو وہ طحاوی اور ائمہ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روا نہ رکھتے، اور حافظ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تعنت کے لئے مشہور ہیں، اس کی عظمت کا اعتراف کرتے"[4]

---

[1] ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ از مولانا عبد الرشید نعمانی ص ۳۰ و ۳۱

[2] ایضاً [3] تقریظ معانی الآثار ج ۲ ص ۵،

[4] ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۳۱،



معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارہ میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے امیر اتقانی لکھتے ہیں:-

"میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض و انکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ معتمد و ثقہ ہیں، اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبہ اجتہاد مسلم ہے، ورع و تقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے، اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی وہ شرف و تقدم رکھتے تھے، ........ اگر تم کو ابو جعفر کے فضل و کمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی"[1]

**شروح و تلخیصات**

معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علماء نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اس کے شروح و حواشی لکھے گئے، اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے،

۱- علامہ بدر الدین عینی (م ۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انھوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا، اور اس کی دو شرحیں معانی الاخیار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دار الکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب ۸ جلدوں میں اور دوسری ۶ جلدوں میں ہے، ان کے علاوہ انھوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخیار فی رجال معانی الآثار ۲ دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دار الکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے[2] زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے،[3]

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۹۲، [2] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳، و فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۴۳، [3] الحاوی ص ۳۳،

۲۔ شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے[1]،

۳۔ ابوالحسین محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الآثار جس کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے، کہ بنکاک میں محفوظ ہے[2]،

۴۔ حافظ ابومحمد علی بن زکریا منبجی مؤلف لباب (م ۶۹۸ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں، اُن کی شرح کا ایک جز آستانہ کے مکتبہ ایا صوفیہ میں موجود ہے[3]،

۵۔ حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ھ) نے الحاوی فی تخریج احادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا ایک جزء دارالکتب المصریہ میں موجود ہے[4]،

۶۔ حافظ ابوعمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں اُن کا حوالہ دیتے ہیں، تلخیص کی ہے[5]،

۷۔ حافظ ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبریلی میں محفوظ ہے[6]،

۸۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے[7]،

۹۔ شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلوی مرحوم نے عربی میں شرح امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ صفحہ ۲۰۴ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۹۲ [2] ایضاً [3] الحاوی صفحہ ۳۳ [4] ایضاً صفحہ ۳۱ و ۳۲، و فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۴ [5] الحاوی ص ۳۳ [6] ایضاً [7] ماتمس الیہ الحاجہ صفحہ ۳،



لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں،

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اُس کو لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰۰ ہے، مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کئے ہیں، ان میں الفاظ و لغات کی تحقیق، اسماء و اعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے،

---

# عصرِ عباسی سے قبل عربی تنقید کا ارتقا

از

جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے، پی ایچ، ڈی (لکچرر وکٹیشور یونیورسٹی آندھرا)

جدید تنقیدی اصطلاح میں عصر عباسی سے قبل کی ادبی تنقید کو "غیر منہجی" کہا جاتا ہے، غیر منہجی کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید اصول و نظریات پر مبنی نہ تھی، بلکہ ذاتی متاثرات اور شخصی میلانات کی ترجمانی تھی، جہاں تک تنقیدی نظریات کا تعلق ہے وہ منظم شکل میں تیسری صدی ہجری میں بھی نظر نہیں آتے، مگر تنقیدی اشارات اسی دور سے نظر آتے ہیں، جب سے ان کی شاعرانہ عظمت سامنے آتی ہے، اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ بغیر اعلیٰ تنقیدی شعور کے کوئی اعلیٰ ادبی شہ کار وجود میں نہیں آسکتا تو پھر یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ عربوں کے یہاں عصر جاہلیت سے تنقیدی شعور موجود ہے، ورنہ جاہلی شعراء غیر معمولی ادبی تخلیق پیش کرنے سے قاصر رہتے، عربوں کے تنقیدی شعور کا واضح ثبوت ان واقعات اور روایات سے فراہم ہوتا ہے، جو آئندہ اوراق میں پیش کئے جارہے ہیں،

عصر جاہلی میں مختلف تنقیدی مظاہر ملتے ہیں، عصر اسلامی یا صدر اسلام میں تنقید میں نظریاتی ڈگر شامل ہو جاتا ہے، اور عصر اموی میں تنقید کو نیا افق ملتا ہے، جو نظریاتی تنقید کے بجائے الفاظ، عبارت اور قالب کی تنقید سے متعلق ہے، اس طرز تنقید کا نمونہ نقائض



جریر و فرزدق ہے، خود عبد الملک کی تنقید میں بھی عموماً لفظی حسن یا فردی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں، اس طرح ادبی تنقید تسلسل کے ساتھ ارتقار کے منازل طے کرتی ہے، پھر یہ تمام خصوصیات ایک منظم شکل میں عصر عباسی میں ظاہر ہوتی ہیں، جو تھی صدی میں قدامہ نقد الشعر لکھتے ہیں جس سے نظریاتی اور اصولی تنقید کا دور شروع ہوتا ہے، عصر عباسی سے قبل جو تنقیدی پیمانے ملتے ہیں اُن سے اگرچہ نہایت بلند اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت ملتا ہے، مگر ان میں نقص یہ ہے کہ وہ غیر مرتب و غیر منظم ہیں، کسی ایک اصول یا نظریہ کی وہ ترجمانی نہیں کرتے، اسی بنا پر ہم ان ادوار کو "غیر منہجی" تنقید کا دور کہتے ہیں، اگرچہ صدر اسلام میں نظریاتی بنیادیں قائم ہوگئی ہیں، مگر اموی دور میں پھر جاہلی روایات عود کر آئیں، اور اس طرح نظریاتی تنقید کے ارتقار میں تاخیر ہوگئی، اس کے باوجود ان ادوار میں تنقیدی بصیرت کا کافی سامان موجود ہے،

**عہد جاہلیت میں عربی تنقید کے مظاہر**

عربوں میں ادبی تنقید کا آغاز عصر جاہلی سے ہوتا ہے، لیکن چونکہ جاہلی، اسلامی اور اموی دور میں کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اس لئے ان ادوار کے تنقیدی پیمانے ان کتابوں میں ملتے ہیں، جو عصر عباسی میں لکھی گئیں خصوصاً شعراء کے تذکروں اور "اغانی" میں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصر جاہلی شعراء اور نقدِ شعر کے بارے میں علمی عہد تھا، جس میں شعراء پر تنقید، اچھے اشعار کا ذوق، شعر و شاعری کا چرچا، اور ادبی مراکز نظر آتے ہیں، عکاظ کے بازار میں اطراف و جوانب سے شعراء جمع ہوتے تھے، اور اپنے اپنے قصائد سناتے تھے، نابغہ ذبیانی کے لئے "سوق عکاظ" میں ایک سرخ رنگ کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا، شعراء اس کے سامنے آکر بیٹھتے تھے، اور اس کو اپنے اشعار سناتے تھے، نابغہ ذبیانی اشعار سن کر ان پر تنقید کرتا تھا، ایک بار مشہور شاعر اعشیٰ نے نابغہ کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا، اس کے بعد حسان بن ثابت نے کچھ اشعار سنائے، نابغہ نے کہا اگر آپ سے پہلے اعشیٰ نے

شعر سنائے ہوتے تو میں آپ کو انس و جن دونوں میں سب سے بڑا شاعر مانتا، حضرت حسانؓ نے فرمایا، خدا کی قسم میں تم سے تمہارے باپ سے اور تمہارے دادا سے بھی بڑا شاعر ہوں، نابغہ نے لیک کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا میرے عزیز تم اس پر قادر نہیں کہ ایسا شعر کہہ سکو،

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی  وان خلت ان المنتائی عنک واسع[1]

(تو اس رات کی طرح ہے، جو آنے والی ہے، اگرچہ تو خیال کرے کہ تجھ سے فاصلہ دراز ہے،)

یہ اور اس قسم کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر جاہلی میں ادبی تنقید موجود تھی، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس دور کی تنقید محض شاعروں کے ذاتی اقوال، و پسندیدگی اور سطحی فکر پر مشتمل تھی، اُن کے پاس متعین تنقیدی پیمانے نہ تھے، اور نہ ان میں ناقدین شعر کا کوئی مستقل طبقہ تھا، اس دور میں تنقید کا پیمانہ صرف ذوق تھا، عروضی عیوب بھی کسی قدر جانتے تھے،

عصر جاہلی کے قصائد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ تنقید کے اصول و نظریوں سے نابلد رہے ہوں مگر اُن کی شاعری میں فن کی پختگی موجود تھی، اور آج تک ناقدوں کا ایک گروہ اعلیٰ شاعری کی مثال جاہلی شعراء اور اُن کے قصائد کو سمجھتا ہے، سبع معلقات کے قصائد کی پختگی، طرز کلام، تشبیب، خیالات، منظر کشی، اور فنی بلندی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور میں شاعری کا فن اوجِ کمال تک پہونچ چکا تھا، اسی بنا پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے ہو کہ جاہلی قصائد اکثر بعد کے گڑھے ہوئے ہیں مگر دوسرے عرب ناقدین اس کو نہیں مانتے۔

جاہلیت میں شعراء کی صفات سے اُن کے نام رکھے جاتے تھے، یہ چیز بھی اُن کے تنقیدی

---

[1] الشعر والشعراء تالیف ابن قتیبہ ج ۱ ص ۱۲۳،



شعور کی جانب اشارہ کرتی ہے، مہلہل بن ربیعہ کا نام مہلہل اس لئے پڑا کہ ہلہلۃ کے لفظی معنی ہیں کپڑے کو باریک بُننا یعنی اس کی شاعری بہت دقیق تھی، مہلہل پہلا شاعر ہے جس نے شعر میں لطافت پیدا کی، اور غریب و نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا[1]، نابغہ ذبیانی کا نام "نابغہ" اس کے اشعار کی فصاحت کی بنا پر رکھا گیا،

اسی طرح کعب غنوی کو عربوں نے کعب الامثال کہا، اس لئے کہ اُس نے اپنے اشعار میں امثال کا کثرت سے استعمال کیا، طفیل غنوی کو طفیل الخیل اس لئے کہا گیا، کہ اس کے کلام میں گھوڑے کی تعریف کثرت سے ہے، امراء القیس بڑا رند بلکہ اوباش تھا، اور شاہی خاندان سے بھی تھا، اس لئے اُس کو الملک الضلیل "بہت بڑا گمراہ، بادشاہ" خطاب دیا گیا[2]،

عصر جاہلی میں یہ طریقہ تھا جو بعد میں بھی جاری رہا کہ ہر شاعر پہلے کسی شاعر کا راویہ بنتا تھا چنانچہ تمام مشہور شعراء اپنے پیشرو شعراء کے "راویہ" رہ چکے ہیں، راویہ کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے استاد کے اشعار یاد رکھتا، اُن کی اشاعت کرتا، اور اُن کے اسلوب کی پیروی کرتا، ہر راویہ کو بے شمار اشعار حفظ ہوتے تھے، اور اُس کی شخصیت ایک ادبی مرکز ہوتی تھی، جس کے پاس دور دور سے لوگ آکر شعر و شاعری کے متعلق گفتگو کرتے تھے، زہیر بن ابی سلمیٰ اوس بن حجر کا راویہ تھا، زہیر کے بیٹے کعب زہیر کے راویہ تھے، کعب کے راویہ حطیئہ اور حطیہ کے راویہ جمیل ہوئے، اس تفصیل سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ قبل اسلام عرب کی شاعری اچھی خاصی ترقی یافتہ تھی، اور نقد کا شعور بھی تھا، مگر ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا،

زہیر بن ابی سلمیٰ کے متعلق مشہور ہے، کہ جب وہ قصیدہ کہتے تھے، تو اُس کو فوراً نہیں

---

[1] الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء تالیف المرزبانی ص ۴۷،

[2] الحیاۃ الادبیہ تالیف عبد المنعم الخفاجی، ص ۱۹۸، ۲۰۱،

سُناتے تھے، بلکہ ایک سال تک برابر اُس کی چک و اصلاح کرتے رہتے تھے، اور پوری طرح نوک پلک درست کرنے کے بعد اُس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، اس عمل کو عہدِ جاہلیت میں پسندیدہ سمجھا جاتا تھا، اور اُس کے لئے "الحولیات" کی اصطلاح تھی، یعنی وہ قصائد جن پر سال بھر حک و اصلاح ہوتی رہی،[1]

امراء القیس اور علقمہ بن عبدہ میں مقابلہ ہوا کہ ان میں کون بڑا شاعر ہے، دونوں کو بڑائی کا دعویٰ تھا، علقمہ نے کہا کہ میں تمھاری بیوی ام جندب کو "حکم" بناتا ہوں وہ جو فیصلہ کرے، اس کو ہم دونوں مان لیں، اُم جندب نے کہا کہ تم دونوں ایک ہی قافیہ اور ایک ہی روی میں قصیدہ کہو اور اُس میں گھوڑے کے صفات بیان کرو، چنانچہ دونوں نے اشعار کہے، اُس کو سُن کر فیصلہ کیا کہ علقمہ امراء القیس سے بڑا شاعر ہے، امراء القیس نے پوچھا کہ اس ترجیح کی وجہ کیا ہے، امراء القیس کی بیوی نے جواب دیا کہ تم نے کہا ہے کہ کوڑے مار کر اور ڈانٹ کر میں نے گھوڑے کو قابو میں کیا اور علقمہ کا گھوڑا بغیر ڈانٹے ہوئے ہوا سے باتیں کرتا ہوا نکل گیا، یہ سن کر امراء القیس نے کہا کہ علقمہ مجھ سے بڑا شاعر ہرگز نہیں، تم اس پر عاشق ہو گی، اور اُم جندب کو طلاق دے دی، اُس نے علقمہ سے شادی کر لی،[2]

اس دور میں عربوں کا شعور اتنا ترقی کر چکا تھا کہ وہ الفاظ کے غلط استعمال کو فوراً پکڑ لیتے تھے، چنانچہ مشہور شاعر طرفہ نے مسیب بن علس کا ایک شعر سُنا جس میں اونٹ کی صفت میں "صیعریہ" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، جو اونٹنی کے لئے استعمال ہوتا ہے طرفہ نے سن کر کہا کہ مسیب نے اونٹ کو اونٹنی بنا دیا،[3]

[1] کتاب العمدۃ ج ۱ ص ۱۲۹، طبع دوم مطبعہ سعادت ۱۹۵۵ء مصر [2] الموشح مؤلفہ مرزبانی ص ۲۸، ۲۹، (مطبوعہ مطبع لندن سلفیہ مصر، [3] ایضاً ص ۶۰،



عصرِ جاہلی میں عرب قافیہ کے حسن و قبیح سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، مشہور واقعہ ہے کہ جب نابغہ ذبیانی مدینہ آئے، تو لوگوں نے ایک "لڑکی" سے کہا کہ ذرا ان کے وہ اشعار جن میں قافیہ غلط استعمال ہے، اُن کو اس طرح پڑھ کر سُناؤ کہ اُن پر اُن کی غلطی واضح ہو جائے، اس لڑکی نے اسی طرح سُنایا، نابغہ نے سُن کر فوراً اپنی غلطی محسوس کر لی، کہ ایک شعر میں انھوں نے "الاسودُ" قافیہ استعمال کیا ہے، دوسرے میں "بالید" ہے، کیونکہ ایک ہی قصیدہ میں ایک قافیہ میں پیش اور دوسرے میں زیر مناسب نہیں ہے، اس اصطلاح کو عربی تنقید میں اقواء کہا جاتا ہے، وہ خود کہتے ہیں، کہ میری شاعری میں خامیاں تھیں، مگر جب مدینہ جاکر وہاں سے پلٹا تو سب سے بڑا شاعر تھا،[1]

عربی تنقید کے بہت سے پیمانے جو عہدِ جاہلیت میں ملتے ہیں، وہ بعد میں بھی باقی رہے، بہت سے ناقدوں نے ذوق کو معیارِ تنقید قرار دیا، ثعلبی نے اہل شام کو پورے عرب پر شاعری میں ترجیح دی، جس طرح جاہلیت میں نقد و شعر کے بازار لگتے تھے، اُسی طرح کے بازار عصرِ اموی میں قائم کئے گئے،

اس دور میں شعراء خود بھی اپنی شاعری پر تنقید کرتے تھے، اور ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، ذوق کے اختلاف اور عصبیت کی بنا پر لوگوں کے خیالات میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، مگر مجموعی حیثیت سے عرب امرؤ القیس کو سب سے بڑا شاعر تصور کرتے تھے، ایک بار حضرت لبید کوفہ سے گذر رہے تھے، لوگوں نے ان کے پیچھے ایک شخص کو دوڑایا، کہ ذرا ان سے پوچھو کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے، اُس نے جاکر پوچھا، آپ نے فرمایا امراء القیس اُس نے کہا اس کے بعد فرمایا طرفہ، اُس نے پوچھا، اُس کے بعد فرمایا میں خود،[2]

[1] الموشح مؤلفہ مرزبانی ص ۳۸، ۳۹، [2] طبقات الشعراء، مؤلفہ ابن سلام مطبوعہ لائڈن ۱۹۱۳ء ص ۱۶،

اس دور میں بعض تنقیدیں مبہم بھی ملتی ہیں، مثلاً ربیعۃ الحذار الاسدی کی تنقیدیں مبہم اور محض اشارات پر مبنی ہیں، زبرقان کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے اشعار اس گوشت کی طرح ہیں، جو گرم ہوگیا ہو مگر نہ پورا پک گیا ہو کہ کھالیا جائے، اور نہ کچا ہو کہ اس سے کوئی اور کام لیا جاسکے، عبدہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے اشعار ایک ایسے گھڑے کی طرح ہیں جس کا ڈھکن مضبوطی سے بند ہو اور ایک قطرہ پانی بھی اُس سے نہ نکل سکتا ہو[۱]، ظاہر ہے کہ یہ تنقید بالکل مبہم اور لاطائل ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے، کہ ناقد کے ذہن میں کوئی واضح رائے نہ تھی،

یہ مباحث و واقعات اس کا ثبوت ہیں، کہ عربوں میں تنقید کا آغاز زمانۂ جاہلیت ہی سے ہوگیا تھا، اگرچہ وہ اصول و ضوابط کی پابندی نہ تھی، پھر بھی معیاری تنقید کے بعض بہت سے اہم پیمانے اس دور میں مل جاتے ہیں،

**عربی تنقید کا ارتقا صدر اسلام میں**

اسلام پوری زندگی کے لئے نئی قدریں لے کر آیا تھا، اس لئے اس نے نہ صرف عربوں کے مذہب میں تبدیلی پیدا کی، بلکہ اُن کی زندگی کی تمام قدروں اُن کے اخلاق اور اُن کے فکر کے پیمانوں کو بھی بدل دیا، اس تغیر کا اثر شاعری پر پڑا، چنانچہ عصر جاہلیت اور صدر اسلام کی شاعری میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے، جب شاعری میں تبدیلیاں ہوئیں، تو اُس کے حسن و قبح کے معیار بھی بدل گئے، اور اسلام نے شاعری کی تنقید میں نئے پیمانوں کا اضافہ کیا،

اس موقع پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عربوں نے شاعری کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اصناف سخن وہی رہے، لیکن خیالات اور طرز فکر میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی، شاعری کے

[۱] الموشح ص ۷۵،



جدید دور سے قبل تک عربوں نے اپنی شاعری کے موضوعات اور ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی البتہ اہل اندلس نے ایک صنف "موشح" ایجاد کی جو عام عربی شاعری سے الگ تھی،

عصر جاہلی میں جو تنقیدی معیار تھے، وہ فکر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، اُن کا دائرہ لغوی، عروضی تنقید اور ذاتی میلان تک محدود تھا، اسلام نے پہلے تو عربی شاعری کے ذہنی رجحانات پر ضرب لگائی، قرآن مجید نے شعراء کو اُن کی بے راہ روی پر متنبہ کیا، کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے، حضورؐ نے فرمایا کہ "شعر سے بہتر ہے کہ آدمی قے سے اپنا پیٹ بھرلے" شعراء کی پیروی کرنے والوں کو گمراہ قرار دیا گیا" لیکن ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کو فحش شاعری، عورتوں کے جسمانی محاسن، شراب کی تعریف اور جوئے کی مدح سے روکا جائے، کہ اسلام کا بڑا مقصد خیالات و اخلاق کی پاکیزگی تھی، پاکیزہ شاعری کو حضورؐ خود پسند فرماتے تھے، اور اسلام کی مدافعت میں اس سے کام لیا ہے، آپ نے قصائد میں جو تشبیب ہوتی تھی اس کو بھی سُنا، اور اعتراض نہیں فرمایا، اس سلسلہ میں حضرت کعب بن زہیرؓ کا قصہ قابل ذکر ہے،

کعب بن زہیرؓ مشہور شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے لڑکے تھے، اور خود بھی بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے حضورؐ کی ہجو کہی آپ نے اُن کا خون ہدر کردیا، اور اُن کی جان کے لالے پڑگئے، ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحم دل ہیں، چنانچہ وہ ایک دن حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کے ساتھ عمامہ باندھ کر شکل بدل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! ایک شخص آپکے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہے، اور ہاتھ بڑھا کر چہرہ سے عمامہ ہٹادیا، اور کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں کعب بن زہیر ہوں، اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں، انصار اُن کو امان دینا پسند نہیں کرتے تھے، مگر قریش اُن کے اسلام سے بہت خوش ہوئے، حضورؐ نے انھیں امان دیدی، کعبؓ نے آپ کی خدمت میں اپنا مشہور قصیدہ

"بانت سعاد" جو آپؐ کی مدح میں کہا تھا پیش کیا،

چند اشعار کے بعد حضورؐ نے حاضرین کی طرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، بعض اشعار
میں انصار پر طنز تھا، قریش نے فوراً ٹوکا اور کہا اگر تم نے انصار کی ہجو کی تو ہماری بھی ہجو
کی ہے، یہ سنکر کعبؓ نے ارتجالاً انصار کی مدح میں یہ شعر پڑھا،

الباذلین نفوسهم لنبیهم    یوم الهیاج وسطوة الجبار

(گھسان کی جنگوں میں نبیٔ کریمؐ کے لئے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں)

اس شعر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط مسرت میں اپنی چادر اتار کر کعب کو اڑھا دی،
جس کو کعب بن زہیر کی اولاد سے بعد میں حضرت معاویہؓ نے ایک خطیر رقم میں خرید لیا[1]

اشعار کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ وہ اچھے بھی ہوتے ہیں، اور خراب بھی، اُن میں
جو حق کے مطابق ہوں وہ اچھے ہیں، اور جو حق کے مطابق نہ ہوں اُن میں کوئی خیر کا پہلو
نہیں ہے، اور شعر کلام ہے، کلام اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی،[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ اشعار اچھے اور خراب دونوں طرح
کے ہوتے ہیں، اچھے اشعار چن لو اور خراب کو ترک کر دو،[3]

حضرت حسانؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کے اشعار کے متعلق آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کے اشعار قریش پر تیروں سے بھی زیادہ گراں گذرتے
ہیں، حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا کہ قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم تمہاری ہجو اندھیرے
میں آدمی پر تیر پڑنے سے بھی زیادہ سخت ہے، روح القدس تمہارے ساتھ ہیں،[4]

---

۱ طبقات الشعراء تالیف ابن سلام مطبوعہ لائیڈن ص ۲۰، ۲۱، ۲ العمدہ ج ۱ ص ۲۷،
۳ ایضاً ص ۲۷، ۴ ایضاً ج ۱ ص ۳۱،



حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ شاعری قوم کی میزان اور اس کو پرکھنے کا معیار ہے[1]
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کے بارہ میں حضرت علیؓ کا واضح نظریہ تھا اس کو وہ انسانی
سوسائٹی کو پرکھنے اور اس کی بلندی و پستی کا اندازہ لگانے کا معیار تصور کرتے تھے، آپ کا
یہ قول دور جدید کے بعض بڑے مغربی ناقدوں کے نظریات سے بالکل مطابقت رکھتا ہے، مثلاً میتھو
ارنلڈ کہتا ہے کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے، (Poetry is criti of life)
اس نظریہ سے ہزاروں سال قبل حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ شاعری قوموں کے اخلاق و سیرت
کی میزان ہے، آپ نے محض زندگی کی تنقید قرار نہیں دیا، بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ صالح
قوم کا ادب بھی صالح اقدار حیات کا ترجمان ہوتا ہے،

حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ شاعری ادب کا سب سے اونچا درجہ ہے،[2]

ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب تم کتاب اللہ پڑھو، اور
اس میں کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے، تو اُس کو اشعار عرب میں تلاش کرو، اس لئے کہ شعر عربوں
کا دیوان ہے، اُن کی پوری داستان اس میں پوشیدہ ہے، جب قرآن مجید کے کسی لفظی
اشکال کے بارہ میں اُن سے کوئی سوال کیا جاتا تھا، تو اُس کی وضاحت کے لئے آپ عربی
شعر پڑھ دیتے،[3]

حضرت ابوبکرؓ نابغہ ذبیانی کو سب سے بڑا شاعر مانتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ وہ بحر کے اعتبار
سے بہت شیریں کلام ہے، اُس کے یہاں گہرائی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے،[4]

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کتنی اچھی بات ہے، کہ آدمی ضرورت کے وقت اشعار پڑھ کر

---

۱ العمدہ ج ۱ ص ۲۸، ۲ ایضاً ج ۱ ص ۲۹،
۳ العمدہ ج ۱ ص ۳۰، ۴ ایضاً ص ۹۵

لوگوں کے دل کو مائل کرتے ہیں[1]

حضرت عمرؓ نے غطفان کے وفد سے دریافت فرمایا کہ یہ شعر کس کا ہے،

حلفت فلم اترک لنفسک ریبة ولیس وراء اللہ للمرء مطلب

میں نے قسم کھائی اور تمہارے لئے کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں باقی رکھی، اللہ کے علاوہ انسان کا کوئی مطلوب نہیں"

لوگوں نے کہا یہ نابغہ بنی ذبیان کا شعر ہے، چند اور اشعار پوچھنے کے بعد فرمایا کہ وہ تم میں سب سے بڑا شاعر تھا[2]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کس کا مصرع ہے،

الا کل شئی ما خلا اللہ باطل

خبردار - خدا کے سوا ہر چیز باطل ہے

آپ نے ایک بار صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں کو امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یاد ہیں، اور ان سے پورے سو شعر سنے[3]

جاہلیت اور اسلام کے معیار تنقید میں بنیادی فرق نظریہ کا ہے، جاہلی شعراء اشعار میں کسی خاص طرز فکر یا نظریہ کے تحت تنقید نہ کرتے تھے، بلکہ ان کے تنقیدی نقطۂ نظر میں ذاتی میلانات کو بڑا دخل تھا، اسلام کے بعد جو تنقیدی پیمانے سامنے آئے، ان میں فکر و فن کے جلوے واضح طور پر نظر آتے ہیں،

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ خاص طور سے شاعری، اور اس کی

۱؎ العمدة جلد ۱ ص ۱۶، ۲؎ الحیاة الادبیه بعد ظهور الاسلام عبد المنعم الخفاجی ص ۳۱۵، ۳؎ مشکوة المصابیح مطبع سعیدیه کراچی ص ۴۶۸، ۴۷۲



تنقید پر گہری نظر رکھتے تھے، ان کے اقوال تنقیدی پیمانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے فرمایا کہ سب سے بڑے شاعر کے کچھ اشعار سناؤ، انہوں نے پوچھا کہ کون سب سے بڑا شاعر ہے، فرمایا زہیر بن ابی سلمیٰ اور اس کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی کہ وہ بات کہنے میں رکاوٹ محسوس نہیں کرتا، غریب و نامانوس الفاظ سے پرہیز کرتا ہے، اور اسی صفت کی تعریف کرتا ہے، جو حقیقی آدمی کے اندر موجود ہوں[1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رائے تھی کہ امرؤ القیس سب سے بڑا شاعر ہے، اس کے یہاں تمام شعراء سے زیادہ ندرت پائی جاتی ہے، اور وہ برمحل اشعار کہنے میں یکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظریہ کی حمایت کو بھی تنقیدی پیمانہ قرار دیا، چنانچہ ایسے اشعار جو اسلام کی مدافعت میں کہے گئے، بہ نظر استحسان دیکھا، اور ان شعراء کی ہمت افزائی فرمائی، یعنی شاعری کو اسلام کی مدافعت کا ذریعہ بنایا اور اس کی غیر صحت مند روایتوں تخیلات اور بے راہ روی پر قید و بند عائد کی، اگر حضرت حسانؓ کے جاہلی دور اور اسلامی دور کی شاعری کا موازنہ کیا جائے تو دونوں کی زبان اور خیالات میں نمایاں فرق نظر آئے گا، اسی نظریہ کی بنا پر حضور سے لیکر صحابہ تک زہیر کی تعریف کرتے ہیں، کیونکہ ان کے کلام میں صداقت ہے،

عبد المنعم خفاجی کہتے ہیں کہ اسلام اور قرآن مجید کا اثر شعر کے اسلوب، الفاظ، سلاست، بلاغت اور قوت پر اسی طرح پڑا، جس طرح ان کی زندگی اور ان کے افکار و تصورات پر پڑا[2]

اسلام کے اثر سے عربوں کی تنقید میں دو طرز فکر پیدا ہوئے، جن کا اصل منظر عصر عباسی ہے

۱؎ طبقات الشعراء تالیف ابن سلام ص ۱۰، ۲؎ الحیاة الادبیه بعد ظهور الاسلام مؤلفه عبد المنعم خفاجی، ص ۱۵،

حضرت عمرؓ نے زہیر کی شاعری کی ایک صفت صدق کو بتایا ہے یعنی وہ مبالغہ نہیں کرتا جو صحیح صفت ہے، اسی کو بیان کرتا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ صداقت صدر اسلام کے ادبی اصولوں میں ایک اہم اصول ہے، حضرت حسانؓ فرماتے ہیں،

ان احسن بیت انت قائلہ　　بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

(بہترین شعر وہ ہے، جس کو سن کر لوگ کہیں کہ سچا ہے)

اموی دور میں جاہلی شاعری مع اپنی روایات کے پھر واپس آگئی، اس لئے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ صدر اسلام کے پیمانے "متنازع فیہ" ہوگئے، چنانچہ عباسی عہد میں "صدق و کذب" دونوں مکتب فکر کے شاعر و ناقد نظر آتے ہیں، بحتری کہتا ہے،

کلفتمونا حدود منطقکم　　والشعر یغنی صدقہ عن کذبہ

(تم ہم کو اپنے منطقی حدود کا مکلف بناتے ہو، حالانکہ شاعری میں جھوٹ سچائی سے بے نیاز کر دیتا ہے،)

قدامہ نے کہا کہ "احسن الشعر اکذبہ" جتنا جھوٹا شعر ہو اتنا ہی عمدہ ہوتا ہے، مگر اس جھوٹ سے مراد مبالغہ ہے،

حضرت عمرؓ کی یہ رائے کہ زہیر وحشی و غریب الفاظ سے بچتے ہیں، درحقیقت اسلامی عہد کا بڑا تنقیدی پیمانہ ہے، بعد کے ناقدین نے بھی غریب وحشی اور مشکل الفاظ کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھا، جو جاہلی شاعری کا بڑا عنصر تھا،

اسی طرح اسلام نے نئی اصطلاحات سے شاعری کے دامن کو مالا مال کیا، حضرت حسانؓ کا دیوان اس کا بہترین مظہر ہے، نئے الفاظ کا ایک ذخیرہ دیا، اور پاکیزہ خیالات سے اس کا دامن بھر دیا، زغلول سلام نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے، کہ اسلامی عہد میں قرآن مجید



کا اسلوب بیان اور حسن تعبیر سکہ نمونہ مانا جاتا تھا اس لئے ادبی و شعری حسن و جمال کے پرکھنے اور اس کے معیار کی تشکیل میں بھی قرآن مجید کے اسلوب کا غیر معمولی اثر پڑا۔[1]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے عربی شاعری کی تنقید میں صدق، سلیس طرز بیان اچھے الفاظ اور مذہبی اقدار کو شامل کیا، چنانچہ حضورؐ نے بعض احادیث میں بھی سلاست کلام پر زور دیا ہے،

**عہد اموی میں عربی تنقید کا ارتقاء**

عربی تنقید کے ارتقاء کا اصلی زمانہ تو عباسی عہد ہے، مگر اس کی بنیادیں اموی عہد میں اصمعی، ابو عمرو بن العلاء، حماد الروایہ اور خلف الاحمر جیسے شاعروں اور ادیبوں نے رکھیں، اس نقطہ نظر سے اموی عہد کا آخری دور بڑا اہم ہے، اس دور میں تنقید فن کی شکل اختیار کرنے لگی، اور شعراء و ادباء کے علاوہ بھی عرب میں ناقدین ادب و شعر کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، اموی عہد کے بعد تصنیف و تالیف کا دور شروع ہوا، عباسی عہد کی تصانیف میں اموی عہد کے اتنے تنقید شعر کے قصے ملتے ہیں کہ اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں،

اسی دور میں جب کہ عربی تنقید محدود شخصی پیمانوں کی تنگنائیوں سے نکل کر اصول و ضوابط کی فنی حیثیت اختیار کرتی ہے، عربی تنقید کے ارتقاء میں بہت سے عوامل اور محرکات کارفرما نظر آتے ہیں، صدر اسلام کے مقابلہ میں اس دور کی زندگی بہت مختلف ہو گئی تھی، اموی عہد نے جو تنقیدی پیمانے دیئے تھے، عربی شاعری ان ہی بنیادوں کی طرف لوٹ آئی تھی، جو جاہلیت میں تھیں، اور وہ اپنی تمام روایتوں اور برائیوں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوگئی تھیں، اسی وجہ سے عربی تنقید کے پیمانے بھی زندگی کی تبدیلیوں سے متاثر

[1] اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۳۰۵،

ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور اسلام نے جو پیمانے عطا کئے تھے، وہ بالکل بدل گئے،

عصر اموی میں امراء، عمال اور خلفاء کے دربار شعر و نقد کا مرجع قرار پائے، بنی امیہ نے عربوں کی بجھی ہوئی قبائلی عصبیت کو دوبارہ زندہ کیا، اور اُس سے اپنی خلافت و حکومت کے استحکام میں مدد لی، انھوں نے شاعروں کو گراں قدر انعامات سے نوازا، وہ خود بھی تنقیدی ذوق رکھتے تھے، خصوصًا عبدالملک کا ذوق بہت بلند تھا،

جراح نے اپنی "الورقہ" میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے، کہ عباس ابن احنف نے ہارون الرشید کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا، اُس نے قصیدہ کو بہت پسند کیا، اور پوچھا کہ اس طرز کے اشعار اور کسی نے بھی تم سے پہلے کہے ہیں، عباس نے کہا کہ نہیں، رشید نے اصمعی کو بلوایا، اصمعی اور عباس بن احنف میں رنجش و مخالفت تھی، جب اصمعی دربار میں پہونچا تو عبدالملک نے اشعار پڑھکر پوچھا کہ اس طرز کی شاعری اس سے قبل بھی ملتی ہے؟ اصمعی نے کہا بہت لوگوں نے اس طرز کے شعر کہے ہیں، اور تھوڑے وقفہ کے بعد ایسے اشعار سنا دیئے، احنف کا بیان ہے کہ میں بہت خفیف ہوا، جب ہم دونوں باہر نکلے، تو میں نے اصمعی کو قسم دلاکر کہا کہ سچ سچ بتاؤ یہ شعر تم نے کہے ہیں یا کسی دوسرے کے ہیں، اس نے جواب دیا، ہاں میرے ہی ہیں، مگر خلیفہ کو میں نے اس طرح سنایا کہ گویا دوسرے کے ہیں[1]"

یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قبائل نے اپنی عزت کی خاطر، اشخاص نے ذاتی بلندی کے لئے اور ارباب حکومت نے اپنی طاقت کے قیام کے لئے عصر اموی میں خاص طور سے اس کثرت سے اشعار گڑھ کر قدیم شعراء کی جانب منسوب کر دیئے کہ اس کے لئے "انتحال" کی اصطلاح بن گئی،

---

[1] کتاب الورقہ ص ۴-۵،



عبدالملک کے سامنے نُصیب کا یہ شعر پڑھا گیا:-

اھیم بدعد ماحییت فان امت فیا ویح دعد من یھیم بھا بعدی

میں دعد کے لئے سرگرداں ہوں جب تک زندہ ہوں اگر میں مرگیا تو افسوس ہے

کہ میرے بعد اس کیلئے کون سرگرداں رہے گا،؟

اقیشر نے کہا کہ واللہ شاعر نے بڑے غلط انداز سے شعر کہا ہے عبدالملک نے کہا اچھا بتاؤ اگر تم کو کہنا ہوتا تو کس طرح کہتے، اُس نے کہا میں یوں کہتا

تحبکو نفسی حیاتی فان امت اوکل بدعد من یھیم بھا بعدی

میں زندگی میں تم سے محبت کرتا ہوں اگر مرگیا تو دعد کو اُس کے سپرد کر جاؤنگا

جو اُس کے لئے پریشان رہے،

عبدالملک نے کہا کہ واللہ تم نے تو اس سے بھی غلط کہا ہے، اقیشر بولا اگر امیرالمومنین کہتے تو کیسے کہتے؟ عبدالملک نے کہا میں اس طرح کہتا:-

تحبکم نفسی حیاتی فان امت فلا صلحت ھند لذی خلۃ بعدی

جب تک زندہ ہوں تم کو چاہتا ہوں اگر میں مرجاؤں تو خدا کرے ہند کسی محبت

کرنے والے کے لئے سازگار ثابت نہ ہو،

حاضرین نے ایک زبان ہو کر کہا کہ امیر المومنین نے سب سے زیادہ شاعرانہ انداز میں کہا ہے[1]

مشہور شاعر راعی نے عبدالملک بن مروان کی تعریف میں قصیدہ پڑھا، جس کا ایک شعر یہ تھا،!

---

[1] عبدالملک بن مروان تالیف عمر ابی النصر، المکتبۃ الاھلیہ بیروت ۱۹۶۲ء ص ۱۱۷،

عرب نری للہ فی اموالنا    حق الزکاۃ منزلا تنزیلا

ہم عرب ہیں، اور اپنے مالوں میں خدا کا حق زکوٰۃ ادا کرتے ہیں

عبدالملک نے کہا کہ یہ شعر نہیں ہے بلکہ اسلام کی تشریح اور قرآن کی آیت کی تلاوت ہے[۵۱]

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ عصر اموی میں شاعری کی تنقید کا شقف ذوق وجود میں آچکا تھا، اور لوگ ذوق شعریہ اور زبان کے محاسن کو تنقید میں بڑی اہمیت دیتے تھے، ایک بار جریر نے عبدالملک کے سامنے ایک شعر پڑھا جس میں لفظ "یوزع" استعمال ہوا تھا، خلیفہ نے کہا کہ یہ لفظ بڑا مکروہ ہے، اس نے شعر کی لطافت و حسن کو ختم کر دیا[۵۲]،

لیکن یہ حقیقت ہے کہ تنقید میں عصبیت کا دخل باقی رہا، مختلف قبائل مختلف شاعروں کو ترجیح دیتے رہے، مثلاً عقیلہ بنت عقیل نے کثیر کے اس شعر پر

اُرید لانسی ذکرھا فکانما    تمثل الی لیلی بکل طریق

میں چاہتا ہوں کہ لیلی کے ذکر کو بھول جاؤں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر راہ میں اس کی تصویر کھنچی ہوئی ہے،

یہ تنقید کی کہ تم کیوں اس کے ذکر کو بھولنا چاہتے ہو[۵۳]، ظاہر ہے کہ یہ تنقید صحیح نہیں ہے، کیونکہ شاعر لیلی کو فراق کی تکلیف کم کرنے کے لئے بھولنا چاہتا ہے مگر بھول نہیں پاتا، اس لئے شعر نہایت حسن سے لبریز ہے،

اسی طرح اہل حجاز عمر ابن ابی ربیعہ کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے، اس لئے کہ وہ حجازی تھا،

---

۵۱ الموشح تالیف مرزبانی ص ۱۵۰ ۔ ۵۲ الشعر والشعراء تالیف ابن قتیبہ، ملاحظہ ہو مقدمہ ۔ ۵۳ الموشح صفحہ ۱۶۰، ۱۶۱۔



بنی تغلب اخطل کو بڑا شاعر اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ اُن کے قبیلہ کا تھا،

مذکورہ تنقیدی نقطوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مذہبی رجحانات صدر اسلام میں پسندیدہ تھے، مگر دوبارہ قبائلی عصبیت اور جاہلی اختلافات پیدا ہو جانے کے بعد صدق و مذہب کا عنصر اس دور کی تنقید سے خارج ہو گیا، تعجب تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے اخطل کو جو نصرانی تھا، اموی خلفاء نے اتنا بیباک کر دیا تھا، کہ اس نے انصار اور اسلام کا مذاق اڑایا،

ذھبت قریش بالمکارم کلھا    وبقی اللوم فی عمائم الانصار

قریش نے سارے مکارم حاصل کر لئے اور ملامت انصاریوں کے عماموں میں باقی رہ گئی،

ان اشعار پر حضرت معاویہؓ نے بھی اس سے باز پرس نہ کی، اکثر وہ شراب میں بدمست عبدالملک کے دربار میں آتا تھا،

اموی عہد میں تنقید کے ارتقاء کا ایک بہت اہم پہلو عربی شاعری کے "نقائض" ہیں، اُن کو "نقائض جریر و فرزدق" کہا جاتا ہے، تین شاعروں جریر، فرزدق اور اخطل میں باہم سخت رقابت تھی، یہ تینوں ایک دوسرے کی مخالفت میں تلخ اشعار کہتے تھے، کہ پوری سوسائٹی اس سے متاثر ہو گئی تھی، ہر محفل کا یہ موضوع ہو گیا تھا، کہ اُن میں کون بڑا شاعر ہے، خصوصاً جریر و فرزدق میں، نتیجہ یہ ہوا، کہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور انیسیے و دبیریے کی طرح ان میں جھگڑے ہونے لگے، "مربد" بصرہ میں ایک بازار تھا، جہاں جریر اور فرزدق کی دوکانیں تھیں، ان دوکانوں پر زیادہ تر شعر و شاعری ہی ہوتی تھی، جس طرح عہد جاہلیت میں "عکاظ" میں شعرا جمع ہوتے تھے، اور اُن کا کلام لوگ سنتے تھے، اور اس پر اپنے ذوق و فہم

کے مطابق تبصرے کرتے تھے، بالکل یہی حال مربد کا بھی تھا، "مربد" میں دونوں شاعروں کے معتقدین جمع ہوتے تھے، اور بہت بڑا ہنگامہ کرتے تھے، یہ ہنگامے اتنے بڑھے کہ بالآخر گورنر بصرہ نے دونوں اڈوں کو گروادیا، پھر بھی اُن کے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی،

فرزدق نے جریر اور اپنے بارے میں بڑی اچھی تنقید کی ہے، کہ "میں اپنے فسق کی وجہ سے جریر کے اندر جو رقت ہے، اس کا محتاج ہوں، اور اُن کو اُن کے عفیف کردار کی وجہ سے میرے اشعار کی درشتی کی ضرورت ہے"[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرزدق کو احساس تھا، کہ غزل میں رقت ضروری ہے جب کہ اُس کے یہاں درشتی زیادہ تھی،

اخطل نے جریر و فرزدق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "جریر سمندر سے پانی لاتا ہے، اور فرزدق چٹان توڑتا ہے"، یہ بڑی صحیح تنقید ہے، واقعہ یہ ہے کہ جریر کی شاعری میں سلاست ہے، اور فرزدق کے یہاں شوکت اور مشکل پسندی غالب ہے،

فرزدق نے نابغہ جعدی پر یہ تنقید کی کہ "ان کے پاس ایک ہزار کی چادر اور ٹکے کا ڈوپٹہ دونوں ہیں" یعنی بلند اور پست دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں،

اخطل کے متعلق جریر کی رائے ہے کہ وہ بادشاہوں کی تعریف میں ید طولیٰ رکھتا ہے، جریر سے پوچھا گیا کہ فرزدق و اخطل کیسے شاعر ہیں؟ اس نے کہا میں تو مدینۃ الشعر ہوں، فرزدق کے پاس صرف فخر ہے، اور اخطل شراب کی بہترین تعریف کرتا ہے، ذوالرمہ کے یہاں پست اور بلند دونوں قسم کے اشعار مل جاتے ہیں،[۲]

ان نقائض و مہاجات سے عربی تنقید کو غیر معمولی فائدہ پہونچا، شعراء میں اچھے و پسندیدہ اشعار کہنے کے جذبہ نے اُن کو کد و کاوش پر مجبور کر دیا، اس لئے ایسے بے شمار

۱؎ الموشح تالیف مرزبانی ص ۱۴۱،



الفاظ استعمال ہونے لگے، جو اگر ان میں چشمک نہ ہوتی تو وہ کبھی شعر کے قالب میں نہ آتے، عام لوگوں میں اچھے شعر سے لطف لینے کا سلیقہ و ذوق پیدا ہوا، الفاظ و ترکیبوں میں وسعت پیدا ہوئی، نقائض نے ادب و تنقید کا ایسا ماحول پیدا کر دیا، جس میں معاشرہ کے رجحانات بھی جلوہ گر ہیں، اس دور کے ناقد کسی ایک شاعر کی فضیلت پر متفق نہ تھے، راویوں کی جماعت فرزدق کو ترجیح دیتی تھی، عام شعراء جریر کی افضلیت کے قائل تھے، عصبیت پھر ابھر آئی تھی[۱]، جاہلی عصبیت اور شعراء کے جھگڑے بھی فائدے سے خالی نہ تھے، اس سے سخن گوئی میں غور و فکر کا ایک عام رجحان پیدا ہوا اور اچھے اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے،

قدیم و جدید کا جھگڑا اسی دور سے شروع ہو گیا تھا، احمر اور اصمعی وغیرہ ایک ہی محفل میں کسی شعر کی تحسین کرتے، مگر جب اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ قدیم شاعر کا نہیں، بلکہ کسی جدید اور زندہ شاعر کا کلام ہے، تو فوراً کہہ دیتے، کہ اسی وجہ سے اس میں تکلف نمایاں ہے، کبھی کبھی اس کو غیر فصیح بتاتے، عصر عباسی میں شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے، ہیں، ان میں اس طرز کے بہت سے قصے ملتے ہیں، جن سے قدامت سے عام شغف اور جاہلی شاعری سے حسن ظن نظر آتا ہے،

ابن ابی عتیق نے عمر بن ابی ربیعہ پر بڑی عمدہ تنقید کی ہے، کہ تم عورتوں کا تغزل نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس کے لئے اشعار کہتے ہو[۲]،

غزل میں حسن سے وجدانی تعلق ظاہر ہونا چاہئے، نفسانی خواہشات کا بیان ابن ابی عتیق کے نزدیک تغزل نہیں ہے،

۱؎ النقائض فی الشعر العربی تالیف احمد الشائب، ص ۲۴۹، ۲؎ الاغانی مطبوعہ دارالفکر بیروت، تالیف ابوالفرج جلد ۱ ص ۴۶

اس دور میں صناعت اور نقد کے الفاظ تنقید کے لئے مستعمل نہیں تھے، بلکہ حکم (فیصلہ) اور قضا کا لفظ استعمال ہوتا تھا، اس کے معنی بھی فیصلہ ہی کے ہیں،

اس دور تک تنقید شخصی پیمانوں سے آزاد نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس میں ذوق اور ذاتی میلانات کو بڑا دخل تھا،

لیکن تنقید میں اصول و مبادی کے رجحانات نمایاں ہونے لگے تھے، جیسا کہ عبدالملک کی تنقیدوں سے ظاہر ہوتا ہے،

---





# امیر الدین آزاد

اور

# اُن کا کلام

از

از جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب

غلام بسم اللہ بسمل تلمیذ غالب کے مکان میں اُن کی زندگی ہی میں آگ لگ گئی تھی[1]، جس سے اُن کا ذخیرۂ کتب تلف ہو گیا تھا، اتفاقی طور پر ایک صندوق میں ایک قلمی بیاض (۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء) آتشزدگی سے بچ گئی تھی جو میرے پیش نظر ہے، یہ بیاض خود امیر الدین آزاد کی تحریر کردہ ہے، اس میں اُس زمانے کے مقامی اور بیرونجات کے شعراء کا کلام ہے، امیر الدین آزاد نے اپنا کلام بھی نقل کیا ہے، جو اُن کے دیوان کی عدم موجودگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے، بیاض دو کالمہ ہے، ہر کالم میں تین اشعار ہیں، ورق کا سائز ۱۲ × ۲۱ سینٹی میٹر، کاغذ ملائم چکنا، اور خط نستعلیق ہے، عنوانات ہلکی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں، چار اوراق (۲، ۳، ۶، ۷) تلف ہو چکے ہیں، اُن کی مجموعی تعداد ۷۰ ہے، ناقص الآخر ہے، آزاد کے کلام کی تفصیل اس

---

[1] غلام بسم اللہ بسمل محلہ قلعہ نزد جامع مسجد بریلی میں رہا کرتے تھے، اب اس مکان میں اُن کے پوتے جناب عبدالقادر رہتے ہیں،

طرح ہے :-

## کلام اردو

ایک مثنوی مسمی بیان عشق تعداد اوراق ۲۸، ایک دو غزلہ۔ تعداد اشعار ۲۲۔ تین غزلیات۔ تعداد اشعار ۴۳، ایک نا تمام غزل تعداد اشعار ۴، دو قطعات۔

## کلامِ فارسی

چار ابیات "کہ ازاں از ہر چیز نام عطا حسین برآید" ایک قطعہ بہ سلسلہ "تاریخ معزول شدن و کمند اس و منصوب شدن کرامت حسین" ایک تاریخ بسلسلہ تعمیر بنگلہ نواب عطا حسین۔

بیاض سے امیرالدین آزاد اور نواب عطا حسین عطا کے درمیان تعلق کا بھی علم ہوتا ہے، آزاد نے اُن کا کلام بھی نقل کیا ہے، نواب عطا حسین عطا ابن نواب عظمت علی بخبیر کا تعلق کمبوہانِ میرٹھ سے تھا، سنبھل سے اُن کی رشتہ داری تھی، دونوں ایک ہی حویلی میں رہتے تھے، شاید اسی قربت کی وجہ سے یہ بیاض سنبھل کی تحویل میں گئی، امیرالدین آزاد کو نواب عطا حسین کی رفاقت میسر تھی، نواب صاحب بسلسلۂ علاج فرخ آباد گئے، تو آزاد ان کے ہمراہ تھے، اس سخن پرور رئیس سے آزاد کے علاوہ کرامت علی خان شہیدی اور محسن علی خان جوشؔ بھی وابستہ تھے،

امیرالدین آزاد کے مفصل حالات نہیں ملتے، صرف چند باتیں معلوم ہوسکی ہیں، وہ میر غلام علی عشرت (متوفی ۱۸۲۱ء) کے شاگرد (بجایت شیفتہ وکریم الدین وغیرہ) اور فارسی کے عالم تھے، انھوں نے بریلی کے مشہور غزل گو اور قصیدہ نگار نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ (متوفی ۱۸۹۲ء) کو فارسی پڑھائی تھی، (بروایت الطاف علی بریلوی[1]) نواب عطا حسین عطا کی رفاقت میں فرخ آباد گئے، اور وہاں اپنے صاحبزادے شیخ یار علی استاد کے ساتھ نواب عظمت علی بخبیر کی سرپرستی میں

---

[1] مؤلف حیات حافظ رحمت خان، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، (ص ۳۲۶)



قیام کیا، (بروایت ولی اللہ[1]، سید علی حسن[2]) ان کا انتقال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا، نیاز احمد خاں ہوشؔ نے قطعہ تاریخ لکھا[3]،

| | |
|---|---|
| جناب مکرم جو آزاد تھے | گئے آہ وہ سوئے دار البقا |
| بہشت بریں کا ہے آزاد مرد | یہ سال رضواں نے بڑھکر کہا |

۱۲۸۳ھ

امیرالدین آزاد کا دیوان دستیاب نہیں ہوتا، ان کا بیشتر کلام مذکورہ بیاض میں ہی محفوظ ہے، سید ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں چھ فارسی اور تین اردو اشعار نقل کئے ہیں، مگر وہ دونوں تاریخ فرخ آباد میں شامل ہیں، شیفتہ اور کریم الدین نے صرف ایک شعر نقل کیا،

| | |
|---|---|
| بن ترے سیر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ | خندۂ گل نے مجھے خوب رلایا ہوتا |

ایک واسوخت (۱۳ بند) "مجموعۂ واسوخت" میں شامل ہے[4]۔ مرتب مجموعۂ واسوخت نے بھی اُن کے کلام کی نایابی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں،

"آزاد تخلص ہے محمد امیرالدین صاحب کا، باشندہ ہیں بانس بریلی کے۔ شاگرد رشید ہیں میر غلام علی صاحب عشرت تخلص کے۔ کلام اُن کا سوائے اس واسوخت کے جو شامل مجموعۂ ہذا ہے، نظر سے نہیں گذرا، نہ اور کوئی شعر اُن کا سُنا،

ایوب قادری صاحب[5] فرماتے ہیں :-

---

[1] مؤلف تاریخ فرخ آباد ۱۲۴۳ھ مخطوطہ رضا لائبریری رامپور ص ۳۲۶، [2] مؤلف تذکرہ صبح گلشن ۱۲۹۵ھ ص ۴۷، بحث شاہجہانی بھوپال۔ [3] از کلیات ہوش۔ ص ۱۱۲ مطبوعہ گلشن فیض لکھنؤ ۱۳۱۲ھ [4] مرتبہ منشی فدا علی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۸ء) [5] مکتوب گرامی جناب قادری صاحب بنام راقم الحروف مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء

"۱۸۳۶ء میں رحیم بخش نے چودھری بسنت رائے کو قتل کر دیا تھا، اُس کے پھانسی پانے پر آزاد نے ایک مرثیہ کہا تھا"[1]

مجھے یہ مرثیہ نہیں مل سکا، اس وقت چند غزلیں، ایک واسوخت اور ایک مثنوی پیشِ نظر ہے،

امیر الدین آزاد کی غزلوں میں آورد ہے، بریلی کے ابتدائی دورِ شاعری کی سادگی جذبات اور تخیل کی رفعت و پاکیزگی نہیں ہے، میر غلام علی عشرت نے بریلی میں خارجی شاعری کی بنیاد رکھی تھی، آزاد نے اس کو فروغ دیا، اور غزل کی رہی سہی دلکشی بھی ختم ہوگئی، ہمارے خیال میں خارجی شاعری کے فروغ کا سبب یہ بھی تھا، کہ بریلی میں انیسویں صدی کا نصف اول تلاش و جستجو کا تجرباتی دور تھا، آزاد اس دور کے نمایندہ تھے، انھوں نے اس مخصوص رنگ کو فروغ دیا، اس کا تکملہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا، نیاز احمد خان ہوش، احمد حسین خان جوش، اور عبدالعزیز خان عزیز نے اپنی قابلِ رشک صلاحیتوں سے اس طرز میں انفرادی شان پیدا کی،

امیر الدین آزاد کا نمونۂ کلام یہ ہے:-

وہ سروِ سہی بالا جب باغ کو جاتا ہے
کیا کیا گل و بلبل کو آپس میں لڑاتا ہے

نت خون کا وہ دریا سفاک بہاتا ہے
اٹھتی جو جوانی ہے طوفان اٹھاتا ہے

گل آتشِ گلشن سے انگاروں پہ لوٹے ہو
جس دم وہ گلِ خنداں گلگشت کو جاتا ہے

سنتا ہے کسی کے جب مہمان اُٹ جاتے
بس پھر تو دلِ ناداں اک دھوم مچاتا ہے

[1] اس واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۳۶۱ (۱۹۳۳ء کا بدایونی اڈیشن)



مارا ہے ہمیں کس نے دزدیدہ نگاہوں سے
زخمِ دلِ غم دیدہ پانی سا چھپاتا ہے

دو حرف نہیں لکھتا خط آئے یہ بھی خفا کے
کیا جانئے کون اُس کو ناخواندہ پڑھاتا ہے

ہوتی ہے مری حالت صحبت میں عجب اُس کی
جاں خوف سے گھٹتی ہے دل ہاتھ بڑھاتا ہے

لکھا ہے مگر اُس کا وصفِ لبِ پان خوردہ
خامہ جو ہنوز اپنا لو ہو میں نہاتا ہے

آتا ہے خطاب اُس کے ہم دیں گے غلامی خط
انجام نظر ہم کو آغاز میں آتا ہے

ناخوش نہ ہوں صاحب بندہ کی خوشامد سے
بگڑی ہوئی بات اپنی ہر کوئی بناتا ہے

خاموش رہے کیونکر بس ایک غزل پڑھ کے
وہ اپنے غزلخواں کو ترغیب دلاتا ہے

ولہ

بے ہیچ نہیں گریہ ساتھ آہ کے آتا ہے
وہ آگ لگاتی ہے، یہ آگ بجھاتا ہے

وہ سروِ روان شاید گلشن میں اب آتا ہے
بلبل مترنم ہے گُل فرش بچھاتا ہے

لکھتا ہے صفتِ خط کی اس رو کے کتابی کے
ہر حرفِ قلم اپنا تصویر بناتا ہے

وہ گُل سا بدن دیکھا شبنم کے دوپٹے سے
بھولا نہیں جامے میں ہر پھول سماتا ہے

حسرت تو نہ رہ جائے تو آئے جو بالیں پہ
یہ صید زبوں یوں ہی آخر ہوا جاتا ہے

جاتے ہو جو تم اے جاں دل کو بھی لئے جاؤ
بھولی ہوئی باتوں کو پھر یاد دلاتا ہے

کیا خوب بنی تو وہ خاکِ دلِ سوزاں سے
طفلی سے نشانہ ہی ہونا اُسے بھاتا ہے

ق

قصۂ غمِ دوری کا کہا ہے کو سُنے گا وہ
اس جوششِ گریہ پہ رونا مجھے آتا ہے

یعنی بہ صفائے رُخ اک بت اگر پڑھ لے
تو صاف مکدر ہو سو مُنہ پہ بناتا ہے

بدنام نہوں کیونکر آزاد یہ فریاد
نامہ کا وہ پنچالا تقل میں لگاتا ہے

دبستان بریلی میں اردو مثنوی کا آغاز ہو چکا تھا، نواب محبت خاں محبت کی مثنوی اسرار محبت ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء، میر غلام علی عشرت کی مثنویات، پدماوت ۱۷۹۶ء اور ریاض تحسین ۱۸۰۰ء، پندت دیا ناتھ وفا کی مثنوی داغ دل ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء، امیرالدین آزاد کی مثنوی بیانِ عشق ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء سے پہلے کی اہم مثنویات ہیں، ہمارے خیال میں عشرت کی پدماوت بطور نمونہ آزاد کے پیش نظر رہی ہے۔

مثنوی بیانِ عشق ۳۲۰ اشعار پر مشتمل تھی، چار اوراق تلف ہو جانے کی وجہ سے اڑتالیس[۴۸] اشعار ضائع ہو گئے، جیسا کہ ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے، مثنوی نواب عطا حسین کی فرمائش پر لکھی گئی تھی،

"حسب فرمائش گلِ گلشن عظمت و کرم گستری گوہر معدن ہمت و صفا پروری نگین خاتم بختیاری، خاتم نگین کامگاری، والا نژاد عالی نہاد، شہر عطا بحر احسان بسیار بخش کم ستاں،

عیط مروت عطائے حسین چمن زار اقبال را زیب و زین

باقبال و دولت با جلال و جاہ بماناد آں خوش منش دیر گاہ

رقم زدۂ خامۂ ژولیدہ بیان شد کاتب القایل غفر ذنوبہ و ستر عیوبہ بتاریخ بست دوم[۲۲] رمضان المبارک ۱۲۴۴ھ ہجری نبوی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کتابت بھی آزاد کے قلم سے ہے جو ۲۲ رمضان ۱۲۴۴ھ کو تمام ہوئی، (مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۲۹ء) تاریخ مثنوی بھی ۱۲۴۴ھ ہے، جو اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے؛ ع :- کہی تاریخ ہے "یہ مثنوی خوب"

(۱۲۴۴ھ)



مثنوی کی کتابت عام روش سے قدرے مختلف ہے، مثلاً

اوسکی = اس کی، اوسی = اسی، اوٹھی = اٹھی، اوسے = اسے، آئی = آئی، بیگنہ = بے گنہ، بہنک = بھنک، بھینگ = بھینگ، بہتا = بیٹھا، سے = سے، جی = جی، جہوٹے = چھوڑی، دہنگ = ڈھنگ، سپ = سے، کم = گم، کہر = گھر، بکہ = بگہ، ذکہ = دہاں = واں

اس مضمون میں مثنوی کے اشعار کا املا میں نے موجودہ رسم الخط میں کیا ہے۔

قدما کے دستور کے مطابق مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے،

ہے اُسی کے نام سے آغاز بخشی کہ جس نے عشق کو تاثیر بخشی

اسی کے شوق میں نالاں ہے بلبل اسی کی حمد میں ہے تر زباں گل

اُسی کے داغ غم سے شمع گریاں اُسی کے سوز سے پروانہ بریاں

اس کے بعد نعت سرور دو عالم پیش کی گئی ہے :-

محمد ہے نبی سارے جہاں کا نہ ہوتا وہ تو پیدا کچھ نہ ہوتا

اسے معراج کو عرش بریں ہے اُسے سجدہ کو مسجد سب زمیں ہے

محمد مقتدائے انبیاء ہے محمد پیشوائے اولیاء ہے

کوئی جانے پیغمبر کو کیا ہے عجب اک مظہر نور خدا ہے

دلیلِ قدرتِ حق اس کو کہئے سراپا رحمتِ حق اس کو کہئے

درود اللہ کا اس پر اور اُن پر جو اُس کی آل ہے پاکیزہ گوہر

اور اُن پر جو کہ ہیں اصحاب اُسکے سپہر فضل کے ایک ایک تارے

ذرا ہوشیار ہو اے ساقی مست کیا بار تعلق نے بہت پست

مجھے دے جام راح روح افزا کہ لکھا چاہتا ہوں ایک قصہ

اُس کے بعد قصہ کا آغاز ہوتا ہے؛

سلف میں شاہ تھا ایک نام محمود — سب اس محمود کا تھا کام محمود

محمود ایک عادل بادشاہ تھا، وہ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے شب کو بھیس بدل کر گھوما کرتا تھا، ایک جوان عشق پیشہ وزیر زادی پر عاشق تھا، جو رات کے وقت محل میں کمند کے ذریعہ داخل ہوکر وزیر زادی سے ملا کرتا تھا، بادشاہ نے جوان کو کمند ڈالتے ہوئے پکڑ لیا، اُس پر چوری کا جرم عائد کر کے ضمانت طلب کی، ایک دوست نے اُس کی ضمانت کر لی، اور وہ صبح تک کے لئے چھوڑ دیا گیا، جوان وزیر زادی سے آخری بار ملنے کے لئے محل میں داخل ہوا، اس کے تعاقب میں بادشاہ بھی پہونچا، چھپ کر جوان اور وزیر زادی کی گفتگو سُنی، اُن کی گفتگو اور پاکدامنی سے بہت متاثر ہوا اور صبح کے وقت جوان کو طلب کر کے وزیر زادی سے اس کی شادی کر دی، کہانی طبع زاد نہیں ہے، جائسی کی پدماوت میں بھی راجہ رتن سین، سنگلدیپ کے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش میں چوری سے متہم ہوکر پکڑا جاتا ہے، اور پدمنی کا باپ راجہ گندھرو سین اس کو پھانسی دینے کا حکم دیتا ہے، آخر میں پدمنی اور رتن سین کی شادی ہو جاتی ہے، بادشاہ کا بھیس بدل کر راتوں کو گھومنا، مشرقی کہانیوں میں عام ہے، عشق صادق، مصائب کے طوفان، اخلاق کی نمود، شاہوں کا عدل اور آخر میں عاشق کی کامیابی اس قسم کی کہانیوں کی عام خصوصیت ہے، بیان عشق بھی ایک منظوم کہانی ہے، اس لئے وہ بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں ہے؛

بیان عشق میں قصہ پن زیادہ ہے، منظر کشی، بامحاورہ زبان، روزمرہ کا لطف اور رسوم کا بیان نہیں ملتا، صنعت گری بھی نہیں ہے، البتہ جذبات نگاری ضرور ملتی ہے، صاف ستھری زبان نے جذبات کی گرمی کو قائم رکھا ہے، مثلاً جب بادشاہ پدمنی کی تلاش میں جوان کو اس کے باپ کے پاس لیجاتا ہے، اس وقت جوان کا باپ جو اس سے سخت نالان تھا کہتا ہے،



کہا بیٹے سے اے کم بخت بدخو — میں کہتا تھا نہ جایا کر کہیں تو
مجھے سمجھائے بن تجھکو نہ رہنا — نہ مانا پر نہ مانا تو نے کہنا
کرے خالق زمیں کا اس کو پیوند — نہ ہو جو باپ کے کہنے میں فرزند

یا جب جوان وزیر زادی سے آخری ملاقات کے لئے جاتا ہے، تو وہ پورا ماجرا سننے کے بعد ہوش کھو بیٹھتی ہے،

ہوئی سنتے ہی نقش خاک وہ ماہ — نکالی درد سے آہ پر آہ،
بہت رو ئی کیا تر آستیں کو — رُلایا ساتھ اپنے ہم نشیں کو
ہوئی یاں تک بوحشت گرم شیون — کہ تھا چاکِ گریباں تا بدامن
کیا جو دشنہ غم سے جگر خوں — بنی وہ رشکِ لیلیٰ رشکِ مجنوں
تپانچوں سے کیا نیلا رُخ اپنا — گُلِ عارض گُلِ سوسن بنایا
نہ ہاتھ اُس کا پکڑ لیتا جو وہ نامؔ — تو مر جاتی وہ اپنے آپ کو مار

جوان اس کو سمجھاتا ہے،

یہی دستور ہے سارے جہاں کا — کمالِ عشق ہے نقصان جاں کا
نہیں غم ہے ہمیں ہے بلکہ شادی — مراد اپنی یہی ہے نامرادی

ملک زادی کہتی ہے

کہ سُن اے عاشقِ صادق میری بات — جو ہو منظور جسمانی ملاقات
تو میں حاضر بدل ہوں اور تابع — نہیں ہے دوسرا یاں کوئی مانع

اس پر جوان کہتا ہے؛:-

یہ سُن کہنے لگا وہ پاک داماں — یہ کیا تم کو خیال آیا میری جان

رہا میں زندگی میں فسق سے دور — دمِ آخر بھلا کیونکر ہو منظور

نہیں تم کو کلام ایسا مناسب — نہایت بات ہے یہ نامناسب

یہ کہتی کیا ہو یہاں کب دوسرا ہے — خدا سے تو ڈرو حاضر خدا ہے

یہ جذبات حقیقت پر مبنی ہیں، ان میں مصنف کا میلانِ طبع شامل ہے، پوری مثنوی مخربِ اخلاق مضامین سے پاک ہے، بوس و کنار، وصل و ہم آغوشی وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں،

مثنوی میں ایسے مواقع کم ہیں جہاں آزاد نے زورِ قلم کا ثبوت دیا ہے، البتہ ایک مختصر سراپا میں اُن کے قلم نے حسن کاری دکھائی ہے، چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں،

شکم میدے کی لوئی صاف شفاف — کمر تارِ نظر چشمِ پری ناف

سُرین وراں بہ رنگِ خرمنِ گُل — سب اُس کی جستجو میں مثلِ بلبل

ہوئی بزمِ امید خستق پُر نور — کہ تھی ساق بلوریں شمع کافور

نگاریں پاؤں کا عالم کہوں کیا — کفِ پا گلشنِ چشمِ تماشا

"واسوخت آزاد" مجموعۂ واسوخت (۱۲۸۵ھ) میں شامل ہے، منشی فدا علی کے بیان کے مطابق مجموعۂ واسوخت" کا مسودہ تین سال اُن کے پاس محفوظ رہا، اس لئے واسوخت آزاد ۱۲۸۲ھ یا اس سے پہلے کی تصنیف ہے، اس طرح اُن کے واسوخت اور متذکرۂ بالا غزلیات و مثنوی کے درمیان تقریبًا چھتیس سال کا وقفہ ہے، اس زمانے میں زبان نے ترقی کی، آزاد کے کلام میں بھی نکھار پیدا ہوا، واسوخت آزاد سے اس عہد کی زباندانی کے فروغ کا اندازہ ہوتا ہے،

واسوخت اکتالیس بندوں پر مشتمل ہے، اس میں بیانِ وصل و عشق کی طرب انگیزی نہیں ہے، سراپا بھی نہیں ہے، اس کی خوبی، اس کا زورِ بیان ہے، چند بند ملاحظہ ہوں،



عشق وہ ہوش رُبا ہے کہ الٰہی توبہ — عشق وہ سیلِ فنا ہے کہ الٰہی توبہ

عشق وہ برقِ بلا ہے کہ الٰہی توبہ — عشق وہ تیغِ قضا ہے کہ الٰہی توبہ

الاماں آتشِ جاں سوز مصیبت ہے عشق

الحذر تابشِ خورشید قیامت ہے عشق

یہ وہ طرفہ گلستاں ہو کہ بہار اسکی خزاں — پھل ہے تلوار کا پھل پھول گُل داغِ عیاں

بلبلِ نغمہ سرا نالۂ موزوں ہے یہاں — چشمۂ چشم ہے جاری عوضِ نہرِ رواں

نفسِ سرد نسیمِ سحری کے بدلے

طائرِ روح اُڑا کبکِ دری کے بدلے

یہ وہ شمشیرِ اجل ہو کہ نہیں اسکی پناہ — اس کا ماہی سے چلا تا بہ قبضہ ماہ

وہم اژدر ہو کہ ہے کام نہنگ اس کا گواہ — گل و بلبل ہیں کرتا ہو ہزاروں کو تباہ

پس کے خورشید فلک خاک کا ذرہ ہو جائے

چرخ سیارا اس اندوہ سے چپ رخا ہو جائے

وہ ہوا ہے کہ بلند آتشِ نہاں کر دے — وہ صدا ہے کہ دماغوں کو پریشاں کر دے

وہ صبا ہے کہ گلستان کو بیاباں کر دے — وہ جفا ہے کہ لبِ نہر پہ افغاں کر دے

یہ وہ لالہ ہے کہ قبا کوہ کا دامن ہو جائے

اور شگفتہ ہو جو گلشن میں سو گلخن ہو جائے

پیش ازیں ایک پری رو کا میں دیوانہ تھا — شمعِ رخسارۂ گلرنگ کا پروانہ تھا

خانۂ کعبۂ دل اپنا صنم خانہ تھا — تختِ شاہی مجھے ننگِ درِ جانانہ تھا

میرے خوش ہونے کے ساماں یہاں کرتے تھے

کام کرنے کا مرے آپ کیا کرتے تھے

اک مری چاہ سے سو چاہنے والے نکلے — ناز ایجاد ہوئے طرز نرالے نکلے،
بالیاں کانوں کی ٹھنڈی ہوئیں بالے نکلے — بالے کیسے مہِ رخسار کے ہالے نکلے

نئی وضعیں نئی حرکاتیں نئی انداز نئے

نئی چلیں صلواتیں نئی ہمراز نئے

پیش ازیں تھا نہ کسی بات پر ایسا انکار — دلبری کیا ہوئی کیا ہو گئے اگلے اقرار
اب جو میں بات بھی کرتا ہوں تو سنتا و شوا — خو یہی آگے سے ہوتی تو نہ بڑھتی تکرار

ایک دم دردِ ترحم سے ہمارا نہ سُنا

بیوفا تجھ سا زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا

میں گیا تجھ سے تو پھر تو بھی زمانے سے گیا — بزم میں بیٹھنے کے لطف اٹھانے سے گیا،
منزلت صحبتِ دلخواہ میں پانے سے گیا — اور وفا پیشوں میں تو آنکھ ملانے سے گیا

حسن صورت نہ رہے ناز فروشی کم ہو

ناک میں قحط خریدار سے تیرا دم ہو

جورِ رُخ سے ستمِ زلفِ دوتا سے چھوٹے — روزِ فرقت سے شبِ غم کی جفا سے چھوٹے
خوب ناکردہ گناہی کی سزا سے چھوٹے — شر گیا خیر ہوئی بندِ بلا سے چھوٹے

تو وہ ہے تجھ سے ملے جو کوئی ناشاد رہے

بندگی میں تری بے فائدہ آزاد رہے

میں نے بڑے بوڑھوں کی زبانی سُنا تھا، کہ امیر الدین آزاد دبستان بریلی کے باوا آدم ہیں، میرے پیشِ نظر تو آزاد سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا دورِ شاعری ہے، آزاد کے اُستاد



میر غلام علی عشرت کو بھی بریلی کی شاعری کا باوا آدم نہیں کہا جا سکتا البتہ صحیح ہے کہ وہ پچھلی صدی میں بریلی کے ایک بڑے اُستاد تھے، اور انھوں نے شاعری میں گلکاری کی رعایت کو فروغ بخشا، اور اُن کے شاگرد نواب نیاز احمد خان ہوش نے اس روایت کو بامِ عروج پہ پہنچایا، اور اُن پر ہی یہ طرز شاعری ختم ہو گیا، اُن کے بعد چند شاعروں نے رفعت تخیل اور صنعت گری کو جذبات نگاری کے مقابلے میں جگہ دی، مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے، اُن کی حالت چھوٹی ہوئی پھلجھڑیوں سے زیادہ نہیں ہے، مختصر یہ کہ جس طرز کی بنا عشرت نے ڈالی تھی، اس کی اشاعت آزاد نے کی، اور اُس کا تکملہ ہوش پہ ہوا،

---

## سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس کتاب کے چھ حصے ہیں،

حصۂ اول (ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات) معہ مقدمہ — قیمت: [illegible]

حصۂ دوم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کا مفصل بیان) — ” [illegible]

حصۂ سوم (معجزہ کے امکان و وقوع پر فلسفۂ جدیدہ، علم کلام، اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث،) — ” [illegible]

حصۂ چہارم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ کام) — ” [illegible]

حصۂ پنجم (فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث) — [illegible]

حصۂ ششم (اسلام کی اخلاقی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل) — [illegible]

”منیجر“

# ادبیات

## حقائق و معارف

از

جناب افقر موہانی صاحب

آئی نہ کام اُن کے جب اپنی زندگانی کس کام کی مِلی بھی گر عمرِ جاودانی

دل کی وہ بیقراری اشکوں کی وہ روانی دنیا سے کیا چھپائیں رازِ غمِ نہانی

تجھ کو کبھی کچھ خبر ہے اے محوِ لن ترانی کیا گذری عاشقوں پر سُن کر تری جوانی

کس کو سنائیں اُن کے وارفتگانِ الفت عبرت بھرا فسانہ حسرت بھری کہانی

پھر بھی نہ کوئی سمجھا رودادِ دردِ الفت ہر چند آنسوؤں نے کی دل کی ترجمانی

دیکھا تھا کیا نظر نے یارب فصلِ گل میں آنکھوں میں پھر رہی ہے ہر چیز دھانی دھانی

بیٹھا ہے ایک عالم تھامے ہوئے دلوں کو اُفِ غارتِ زمانہ ظالم تری جوانی

کیونکر بدل نہ جاتا سُن کر نظامِ عالم دل کی مرے کہانی وہ بھی مری زبانی

دنیا میں جب نہ پایا جانباز کوئی مجھ سا روتی ہے مجھ کو میری اب مرگِ ناگہانی

آتا ہے یاد افقرؔ صحنِ چمن میں اکثر

ساقی کا دستِ رنگیں، وہ جامِ ارغوانی

……٭……



## غزل

از

جناب طالبؔ جے پوری صاحب

اب اعتبار وعدۂ باطل نہیں رہا یعنی کہ سعیِ شوق کا حاصل نہیں رہا

پہلو میں جس کے درد بھرا دل نہیں رہا دونوں جہاں میں وہ کسی قابل نہیں رہا

سیلابِ حادثات کی بیداد الاماں ساحل بھی میرے واسطے ساحل نہیں رہا

جو بات میں نے چاہی وہ دشوار ہوگئی جو امر اُس نے چاہا وہ مشکل نہیں رہا

اب جس کو دیکھئے وہی بنتا ہے سرفروش کیا اس دیار میں کوئی قاتل نہیں رہا

خستہ ہو یا شکستہ ہے سرمایۂ حیات وہ دل جو تیری یاد سے غافل نہیں رہا

جو کچھ عطا ہوا، وہ مجھے بے طلب ہوا وہ طالبِ کرم ہوں جو سائل نہیں رہا

مایوس ہو کے دل کو سکوں تو ہوا نصیب لیکن وہ لطفِ وعدۂ باطل نہیں رہا

طالبؔ میں اپنے جہل سے آگاہ جب ہوا

کوئی مری نگاہ میں جاہل نہیں رہا

---

# مطبوعات جدیدہ

**عرب وہند عہدِ رسالت میں**: مرتبہ جناب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۰۰، قیمت: للعہ

پتہ: ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶،

عرب وہند کے قدیم تعلقات اور عربوں کی جہازرانی پر اردو میں سب سے پہلے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دادِ تحقیق دی، اور اس موضوع پر دو مبسوط کتابیں لکھیں جنھوں نے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک مستقل راستہ کھول دیا، قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو بھی اس موضوع سے دلچسپی ہے، اس سے پہلے انھوں نے رجال السند والہند کے نام سے عربی میں ایک کتاب تالیف کی جس میں ساتویں صدی ہجری تک کے ان ہندوستانی علماء وفضلاء کے تراجم قلم بند کئے، جن کا تعلق عرب سے بھی تھا، اب انھوں نے یہ نئی کتاب تالیف کی ہے، اس میں شروع میں عرب وہند کے قدیم بحری وبری راستوں اُن کے اہم مقامات اور ان ہندوستانی شہروں کے نام جن کی پیداوار اور مصنوعات عرب جاتی تھیں، اور عرب میں اُن کی منڈیوں کے نام تحریر کئے ہیں، آخری ابواب میں عرب میں ہندوستانی قوموں کی آبادی

.........



دعوتِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہندوستان سے اور اہل ہند کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت عہدِ رسالت میں عرب میں ہندوستانی اشیاء کے رواج اور اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا ذکر ہے، کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں عرب میں آباد سات ہندوستانی قوموں کے ناموں کی تحقیق اور اُن کے متعلق تفصیلی معلومات لکھے گئے ہیں، ضمناً جاہلی عرب اور ہندوستانیوں کے بعض مذہبی عقائد مثلاً اصنام پرستی میں یکسانی عرب کے ہندوؤں کے صابئہ ومجوس ہونے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہندوستانی راجاؤں کے وفود کی آمد اور ہدایا کی پیشکش، دونوں ملکوں کی زبانوں کے توارد کی بعض مثالیں بھی تحریر کی گئی ہیں، حضرت سید صاحبؒ کی تصنیف عرب وہند کے تعلقات اس موضوع پر اتنی جامع اور مبسوط ہے، اور اس میں عرب وہند کے تعلقات کے ہر پہلو پر اتنے معلومات جمع کردیئے گئے ہیں، کہ اُن پر مشکل ہی سے اضافہ کیا جاسکتا ہے، اس کتاب میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم مصنف نے بعض نئی باتیں بھی لکھی ہیں لیکن عہدِ رسالت کے واقعات اور عرب وہند کے تعلقات کے ذکر میں ماخذوں کی صحت واستناد کا جس قدر اہتمام ولحاظ ہونا چاہیئے تھا، وہ نہیں ہے، بعض مباحث میں غیر ضروری تکرار بھی ہوگئی ہے جو گراں گذرتی ہے، مجموعی حیثیت سے کتاب مفید اور مطالعہ کے لائق ہے،

**عظیم بیداری اور جمہوریت کا چیلنج**: مترجمہ جناب جلیس عابدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات: ۲۹۶، قیمت ۸عہ پیسے

پتہ: نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی، ۶

مشہور برطانوی مفکر جان سٹریچی نے اپنی وفات سے کچھ پہلے سنگاپور میں چند تقریریں کی تھیں، یہ کتاب اُن کا اردو ترجمہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں پانچ اور دوسرے میں دس تقریریں ہیں، اُن میں مصنف نے پرانی نوآبادیاتی حکومتوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے، اور موجودہ دور

کے انقلاب اور اُس کی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اور سامراج کی حقیقت بیان کی ہے، اور اُس کے متعلق لینن اور دوسرے کمیونسٹوں کے خیالات اور اُن کی سامراج دشمنی کے دعوی کی مفصل تردید کی ہے، نئے امریکی سماج یا اور کسی سامراجی طاقت کے موجودہ زمانہ میں اُبھرنے کے اندیشہ کو ناممکن بتایا ہے، ایک تقریر میں انھوں نے چین اور ہندوستان کی ترقیاتی اسکیموں کا موازنہ کرکے اوّل کو خرگوش اور دوسرے کو کچھوے سے تشبیہ دی ہے، کتاب کے آخری حصّوں میں جمہوریت کی تعریف، اس کا تجزیہ اور اس پر بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور ڈکٹیٹرشپ اور کمیونزم کے نقائص بیان کرکے جمہوری، کمیونسٹ اور سوشلسٹ نقطہائے نظر کا باہم موازنہ کیا گیا ہے، مصنف خود جمہوری سوشلزم کے قائل ہیں، لیکن اُن کے تجزیے غیر جانبدارانہ اور بعض خیالات غور و فکر پر مبنی ہیں، مجموعی حیثیت سے موجودہ دنیا، اور اس عہد کے حالات و تبدیلیوں کے متعلق یہ بڑی معلوماتی کتاب ہے، اور ترجمہ بھی سلیس ہے۔

**حمید نظامی**۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۱۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت:- ع۶/ ۲۵ پیسے، پتہ:- مطبوعات چٹان، ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور۔

آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے اس کتاب میں مشہور پاکستانی صحافی اور روزنامہ نوائے وقت کے اڈیٹر حمید نظامی مرحوم کے متعلق اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات تحریر کئے ہیں، ان کی سیرت و کردار، اُن کی خصوصیات اور زندگی کے نمایاں پہلوؤں مثلاً صحافتی کمالات، تحریک پاکستان کی حمایت، جرأت و بیباکی، خودداری، مروّت و حسن و سلوک، مظلوموں سے ہمدردی، حریفوں سے چشمک، ارباب اقتدار سے چپقلش، اُن کے شب و روز کے مشاغل کی تصویر کھینچ دی ہے، آغا صاحب کے مصور و مرقع نگار قلم نے ایک داستان میں کئی اور داستان بھی



ملا دی ہیں، انھوں نے حمید نظامی کی سرگذشت کا یہ خاکہ گذشتہ سال اپنی اسیری کے زمانہ میں ہفتہ عشرہ کے اندر ارتجالاً قلمبند کیا تھا، اس لئے اس میں بڑی بے ساختگی اور برجستگی، اور ان کی پُرزور انشا کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔

**بارشِ رحمت و بارانِ رحمت**: از جناب مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت بالترتیب عہ، ۵۰ پیسے، پتہ:- نظامی کمبل ایجنسی بدایوں - یو-پی۔

یہ دونوں مجموعے مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی وکیل بدایوں کے فکرِ سخن کا نتیجہ، اور قصائد نعت و منقبت پر مشتمل ہیں، اس میں مصنف نے اخلاص و عقیدت کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات کی مصوری بھی کی ہے، کلام کا معیار معمولی اور طرزِ بیان سادہ ہے۔

**اللہ میاں کا جادو** مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی صاحب متوسط تقطیع صفحات
**اخلاقی کہانیاں** بالترتیب ۶۸، ۴۴، ۱۱۴، ۱۰۴، کاغذ، کتابت و طباعت
**بچوں کی شہرت** بہتر قیمت: ۸۰ پیسہ و [illegible] پیسہ و [illegible]

پتہ: صدیقیہ بک ڈپو، بھنڈی بازار بمبئی ۳

لائق مصنف ایک تجربہ کار معلم ہیں، انھوں نے بچوں کی اصلاح و تربیت اور بنیادی و ضروری معلومات کے لئے اُن کے مذاق اور طبیعت کے موافق نہایت دلچسپ زبان اور آسان انداز میں کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، یہ تینوں کتابیں اسی سلسلہ کی ہیں، پہلی کتاب میں قدرت کے مختلف کرشموں، بادل، بارش، ہوا، سورج اور نباتات وغیرہ کے علاوہ گاؤں، عجائب خانے اور قومی و مذہبی تہواروں کے متعلق بچوں کے لئے مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، دوسری کتا

میں چند بڑے پیغمبروں اور ہندوستان کے بعض سادھو سنتوں کے قصے، مہاراشٹر کے بعض دیوں اور بمبئی کے مخیر لوگوں کا ذکر ہے، تیسری کتاب میں، اسکول، پنچایت، گاؤں پنچایت، میونسپلٹی کارپوریشن صوبائی اسمبلیوں، بمبئی کے نظم و نسق، اور تمدن و شہریت وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں، ہر کتاب میں ضروری، مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی آداب سے بچوں کی واقفیت کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اس حیثیت سے ان کتابوں میں مذہب اخلاق، معاشرت، سائنس، جغرافیہ، شہریت اور تمدن وغیرہ کے متعلق گوناگوں قسم کے ضروری اور مفید معلومات جمع کر دئے گئے ہیں، اور بچوں کے ذہن کو بار سے بچانے کے لئے مکالمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے، یہ تینوں کتابیں بچوں کے لئے نہایت مفید اور ان کے کورس میں شامل کئے جانے کے لائق ہیں،

**تفسیر المعوذتین:** از حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مترجمہ مولانا حمید الزماں کیرانوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، و طباعت، عمدہ، صفحات ۵۲، قیمت: عہ رہ مجلس معارف القرآن دار العلوم دیوبند،

مجلس معارف القرآن دیوبند نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تصنیفات کی اشاعت کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے، یہ رسالہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں حضرت نانوتوی کے فارسی رسالہ "اسرار قرآنی" کے ایک حصہ کا جو معوذتین کی تفسیر کے متعلق تھا، عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے، رسالہ استعاذہ کی حقیقت، مستعاذ بہ اور مستعاذ منہ کے متعلق لطیف اسرار و نکات پر مشتمل ہے، شروع میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مصنف کے حالات و کمالات تحریر فرمائے ہیں،

"ض"